

عَلَيْكُمْ اَنْتُمْ اَلْبَصْرَةُ مِنْ اِذَا اَلْقَدْرُ

طلوع اسلام



مارچ ۲۸



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

طلوع اسلام (کراچی)

دوڑ تھانی

بدل اشتراک

مرتب

دس روپے

سالانہ

چھ روپے

ششماہی

مجموعیوں

قیمت فی پریم

جلد ۱

ایک روپیہ

۳ شمارے

فہرست مضمولات

۶۲	حاسب نفس	۲	اے چشم اشکبار
۸۱	باب الاسلام (سندھ)	۳	ہم پر کیا بیٹی؟
۹۶	ہدایہ تہذیب کفرت و ذریعہ الیات	۴	دکالت حق و صداقت
۹۶	جلس ہفت روزانہ کے مراکز سے	۵	لمعات
۱۰۸	کچھ بھی نہیں (جناب آہستانی)	۲۰	نوگر محمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سنئے
۱۰۸-۱۱۳	دل بول جائیں گے تعلیم دلچسپ (جناب ادریس سرراج پاکستانی)	۲۴	تقسیم ہند کا آئینی پہلو

ہم پر کیسا بیتی!

گذشتہ حوادث میں،

ہم پر کس طرح اچانک مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

ہماری زندگی کا اثنا کس طرح ہمارے سامنے لٹا۔

ہمارے بچے کس طرح ہماری آنکھوں کے سامنے ذبح ہوئے۔

ہمارے ہاڑے بزرگ کس بیسی کی حالت میں قتل کئے گئے۔

بہنے جبا ہوتے وقت ایک دوسرے کو کن حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

ہم خانماں برباد کہاں کہاں پھرے اور کہاں کہاں کے دھکے کھا کر کسی گوشہ عافیت میں پہنچے راؤ

پھر وہاں اپنوں نے ہم سے کیا کیا۔

فرضیکہ وہ جو سنا کرتے تھے کہ

خدا مرد کو بھی یہ خواب بہ نہ دکھلائے نفس کے سامنے جلتا تھا آشیاں اپنا

اس خواب بزد کو کس طرح ہم نے مشہور پیکروں میں اپنے سامنے دیکھا۔

یہ سب کچھ آپ کے ذہن میں تو محفوظ ہے، لیکن آپ کے بچوں کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکیگا۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد خود آپ کا ذہن بھی اس تلخ یاد کو بھلا دینے کی کوشش کرے۔

اس داستان الم کو محفوظ رکھنے اور آگے منتقل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہماری آنے والی نسلوں کو اس حقیقت کا احساس رہے کہ

تقدیر کے نامنی کا یہ سنتوی ہے اول سے ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاہات

اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جس وقت ہم پر یہ سب کچھ بیت ہوا تھا تو ہمارے وہ چارہ ساز جو قوم کے ضمیر میں کھینچے تمام کر ملتے مارے پھر اگرتے تھے کس طرح ہماری بربادیوں کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔

اسے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے اور اس کا طریق یہ ہے کہ "آپ پر جو کچھ بیتی" اسے بے کم و کاست لکھ کر ہیں بھجی بیجئے۔ طلوع اسلام میں یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اور پھر لے عنذ الضرورت، بچا

کو دیا جائے گا۔

وکالتِ حق و صداقت

پراپگینڈا!

یعنی وہ فن شریف جس کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ جھوٹ کو سو مرتبہ دہرائیے تو وہ سچ بن کر دکھائی
اقدام مغرب کا سب سے بڑا مؤثر حربہ یہی اہلیسا نہ فریب کاری ہے، اور ان کے شاگردان رشید، ملکیت
ہندیہ کے ارباب سیاست کے عویش کا سب سے زیادہ کارگر تیسری ورونغ بافانہ عیاری - دہل و فریبیاد
کذب فہموں سازی کے ہی وہ رستموں کے سانپ، تھے جن کی پٹاری - جادوگر ان عہد حاضر، مریخی فہوار
عہد اللہ کشمیری کے سر پر رکھ کر اقدام متحدہ کی وکالتِ عالیہ میں مریخی نگاہ فریبی پہنچے۔ اس جزم و
یقین کے ساتھ کہ حق باطل کی ان فوج آرائیوں اور جھوٹ کی ان طبع سازیوں کے نیچے وہ بکر رہ جائیگا
اور وہ سرزمین کشمیر کی ڈگری لے کر خارج دماغ و دماغ لوٹیں گے۔

لیکن جن اتفاق سے پاکستان کو ایک ایسا قابل وکیل مل گیا جس نے اس کے حق و صداقت پر مبنی
دعوے کو اس انداز سے پیش کیا کہ اس کے دلائل برابر ہیں، حصے موسوی بن کر رسوں کے ان تمام سانپوں کے
نگل گئے اور ایک نیلے دیکھ لیا کہ ان الباطل کا ان زہو قار باطل نہا ہی اس لئے ہوتا ہے کہ حق کے مقابلہ
میں میدان چھوڑ کر بھاگ جائے

ہم پاکستان کو اس عظیم انظیر کا سیلابی پستی حق ہزار تیر کی تہنیت سب سے میں اور دھار کرتے ہیں کہ
خلفے برحق اسے حق و باطل کے ہر سروک میں کا سیلابی عطا کرے اور اس کے دشمن اس طرح خاسر و نامراد واپس لوٹا
کہیں کہ شریفوں کی مجلس میں پھر منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔

لَهُمْ فِي النَّارِ نِيَابُخْتِي وَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱۱۱)

ان کے لئے دنیا میں رسوائیاں ہیں اور آخرت میں بہت بڑا عذاب۔

معا

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں ہم نے ہندوستان میں نہ جانے کتنے مسلمانوں کے مستقبل سے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ میں معلوم ہے کہ وہاں ان کی ملی زندگی کا شیرازہ بکھیرنے اور ان کی ہیئتِ اجتماعیہ کو منتشر کرنے کے لئے سب کچھ کیا جائے گا اور اس ضمن میں انہیں بہت سی صعوبات و مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ پرچہ ابھی پریس سے باہر ہی نہ آیا تھا کہ اس خدشہ کے عملی آثار فضلے ہند میں لرزہ انگیز دکھائی دینے لگے۔ جہاں گاندھی کے قتل کے سلسلہ میں راشٹرپتھ سیکرٹری کو خلاف قانون قرار دیا گیا اور اس کے ان اولیٰ و متعلقین کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں جن کے ہاتھ لاکھوں گناہوں کے خون سے رنگین تھے اور جن کے فولادی پنجے، سیوا جی کی تقلید میں، خود اس سب سے میں بھی پیوست ہو چکے تھے جو ابھی چند روز پہلے انہیں مسلمانوں کے قتل و غارت گری کے جرم سے معصوم قرار دینے میں ان کے لئے سپرین جج تھا۔

مسلمانوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان کے ساتھ ہی مسلم لیگ نیشنل گارڈز کو بھی خلاف قانون قرار دیا گیا اور صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ ان احکامات کے صدور کے ساتھ ہی دھڑا دھڑان کی گرفتاریاں بھی شروع ہو گئیں۔ عدل و انصاف سرنگوں اور حق و راستی انگشت بندنوں تھے کہ بالآخر ان بیچاروں کو کس جرم کی پاداش میں حوالہ قید و بند کیا جا رہا ہے۔ ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ انتظامی مصلح کا تقاضا تھا کہ

ملہ مشرقی پنجاب اور دہلی وغیرہ میں مسلمانوں کے قتل عام کے سلسلہ میں جب ہر طرف سے شورا ٹھہ رہا تھا کہ سب کچھ پیشتر پریس سیکرٹری اور ایسی قبیل کی دوسری جماعتوں کی طرف سے ہو رہا ہے تو اس وقت خود جہاں گاندھی نے کہا تھا سنگھ کے ذمہ دار افراد سے مل کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ تو سیوا جی کی قسم کی خدمت کرنے والوں کی سوامائی ہے۔ تاہم قتل و غارت گری سے کچھ واسطہ نہیں۔

دہاں کسی فرقہ دارانہ جماعت و رضا کاران کو قائم نہ رہنے دیا جائے لیکن گرفتاریاں تو ان ہی کی ہو سکتی تھیں جو اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایسی جماعت کے قیام پر مصروف تھے۔ ان بے چاروں نے تو کہیں بھی خلاف ورزی قانون نہیں کی۔ دنیا نے آئین و ضابطہ کے نام پر آئین و قانون کی اس طرح مٹی پیدا ہوتے بھی کم دیکھی ہوگی کہ کل تک جو جماعت آئین کے مطابق تھی، اسے آج صبح سے خلاف قانون قرار دیا جائے اور جو کل تک اس کے رکن تھے انھیں اس جرم کی یاداش میں کہ جب جماعت خلاف قانون تھی تو وہ اس کے رکن کیوں تھے، کال کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے کہا جاسکتا ہے کہ جب ان گرفتار شدگان کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہو سکا تو انھیں رہا کر دیا جائے گا لیکن سدی کی نگہ جہاں میں نے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا اسے کس طرح فراموش کیا جاسکتا ہے کہ کسی جنگل میں دیکھا گیا کہ ایک لومڑی بدحواس اور سراسیمہ ادھر سے ادھر بھاگ رہی ہے۔ پوچھا گیا کہ اس وحشت و سراسیمگی کا سبب کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ بادشاہ کے ملازم اونٹوں کو بے گاریں پکڑ رہے ہیں۔ پوچھنے والے نے سن کر کہا کہ وہ اونٹوں کو پکڑ رہے ہیں تو ہمیں اس سے کیا خطرہ! اس نے کہا کہ تم اسے کیا سمجھو۔ اگر کسی نے مجھے اونٹ بچہ کے شبہ میں پکڑ لیا تو جب تک یہ ثابت ہوگا کہ میں اونٹ بچہ نہیں، لومڑی ہوں، اس وقت تک میرا جہلم بھی ہو چکا ہوگا۔

ہندوستان کی عدالتوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیش نظر لومڑی کو اونٹ کہہ کر ذبح کر دینا مستبعد ہے نہ موجب استعجاب۔ اور ہارا تو خیال یہ ہے کہ چند دنوں کے شور و شیون کے بعد، راشٹرپتیوک سنگھ کسی اور نقاب میں وجود پذیر ہو جائے گا اور مسلم لیگ نیشنل گارڈز کی ہستی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ یہ خطرہ محض مہوہوم و مزعوم نہیں، بلکہ قرآن اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ راشٹرپتیوک سنگھ چونکہ ہاسبماہی کی ایک شاخ کا نام ہے اس لئے، دہاں کی مرتعش فضا میں قدرے سکون پیدا کرنے کے لئے، ہاسبماہی فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنی سیاسی جدوجہد کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دے اور اپنی تمام تگ و تازہ ہندوؤں کی تنظیم کے لئے وقف کر دے۔ گویا ہندوؤں کی تنظیم سیاسی عوامل میں سے نہیں بلکہ خالص ادنیٰ مشغلہ ہے۔ (۱۱۔ مقدمہ پر قبضہ)

کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز اپنی اشاعت مورخہ پیم کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھتا ہے۔
 ہمارے نزدیک اس باب میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ ہندو ہاسبا کے اس فیصلہ کے بعد کہ
 دعا ہے آپ کو رضا کارانہ طور پر ختم کر دے، اب مسلم لیگ (اور اسی قسم کی دیگر فرقہ دارانہ جماعتیں
 بھی) ہاسبا کی تقلید میں اپنے آپ کو ختم کر دیں گی۔ یہی نتیجہ ہے جس کے لئے ڈاکٹر شام پٹا
 کرجی اور ان کے رفقاء نے کاربے تابی سے متنبی ہیں۔

غور فرمایا آپ نے کہ ہندو ہاسبا کی رضا کارانہ تحلیل کا فیصلہ کس غرض سے کیا جا رہا ہے؟
 اس غرض سے کہ اس طرح ہندوستان سے مسلم لیگ کے وجود کو ختم کر دینے کے لئے وجہ جواز
 مل جائے گی۔ بعیدہ جس طرح راشٹریہ سوک سنگھ کے خلاف قانون قرار دینے سے، مسلم لیگ نیشنل کانڈ
 کے خلاف قانون قرار دینے اور اس طرح ان کی ہستی کو فنا کر دینے کا یہاں تراش لیا گیا۔ چنانچہ اس
 کے بعد ہندوستان کے مختلف صوبوں میں خود مسلمانوں نے مسلم لیگ کو توڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے
 بعض جگہ ڈے کے مارے اور بعض جگہ بطور احتجاج۔ حالانکہ ہاسبہا نے اپنی سیاسی سرگرمیاں بالکل ترک
 نہیں کر دیں بلکہ انھیں ملتوی کر دیا ہے۔ مشر بہو پیکر صدر آل انڈیا ہندو ہاسبہا نے اسی فیصلہ پر تبصرہ
 کرتے ہوئے اجابری نائینوں کو یہ بیان دیا کہ وہ آئندہ انتخابات کے لئے تیاری کر رہے ہیں۔

ہم نے ان تہم خطرات (بلکہ ان سے بھی اشد صعوبات و مشکلات) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
 لکھا تھا کہ ان کا مقابلہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے ایمان محکم اور عزم راسخ سے ہو سکے گا
 اور کسی طرح سے بھی نہیں ہو سکے گا۔ لیکن شرم و ندامت سے ہماری نگاہیں زمین میں گر جاتی ہیں اور
 مستقبل کے بھانگ تصور سے ہماری روح میں تھر تھری پیدا ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں
 کے مسلمانوں نے بالعموم کس درجہ تر زلزلہ ایمان اور زرع یقین کا ثبوت دینا شروع کر دیا ہے۔ تو میں
 دشمنوں کی قوت سے کبھی فنا نہیں ہوا کرتی، وہ فنا ہوتی ہیں خود اپنے صنہف خودی اور عدم یقین سے۔
 جانے کہ بخشندہ دیگر نگیسزند آدم بمیرداز بے یقینی

دشمن کی قوت سے وہ عارضی طور پر مغلوب ہو سکتی ہیں، مغترب ہو سکتی ہیں، محکوم ہو سکتی ہیں لیکن اگر ان کے سینہ میں اپنے ملی تشخص کے بقا کی تمنا، اپنے تصوراتِ زندگی کے استبھاک کی آرزو، دنیا میں زندہ رہنے اور آبرو مندانه حیثیت سے زندہ رہنے کی خواہش موجود ہے، اگر انہیں اپنے مستقبل کی زندگی پر یقین ہے، اگر اس حقیقت پر ان کا ایمان ہے کہ ان کا وجود صفحہ دہر پر حرفِ مکر نہیں بلکہ —

ثبت است بر جریرہ عالم دوام ما — تو دشمن کا عارضی غلبہ و تسلط انہیں کسی صورت میں بھی مروجب نہیں کر سکتا بلکہ اس سے ان کے سینے کے اندر دبی ہوئی چنگاریاں اور بھی بھڑک اٹھتی ہیں اور وہ غیرتِ محبت کی ایک لرزہ انگیز پھیری سے جھپٹی ہیں اور اپنے ضیفی پنجوں سے فریقِ غالب کی گردن مروڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ ہمارا خیال تھا — اور کس قدر خوش آئند تھا یہ خیال — کہ دس برس کی تلاطم خیزیوں اور گذشتہ حوادث و فوازل کی صعب انگیزیوں سے ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ ایمان کہ

مٹ نہیں سکتا کسی مردِ مسلمان کہ ہے اس کا ذائقہ سے فاش، تر کلیم و خلیل

حکم سے حکم تر ہو چکا ہے اس لئے تقسیم ہند کے بعد ہندوؤں کی یہ عارضی بالادستی ان میں جذبہ مروجیت نہیں پیدا کرے گی۔ لیکن، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ابھی کسی امتحان و آزمائش کا موقع بھی نہیں آیا اور مسلمانوں نے بالعموم اس قسم کے تماذن و ہانت، ایسے تزلزل یقین و تذبذب ایمان، اور ضعفِ خودی اور تسلِ نفس کے مظاہرے شروع کر دیئے ہیں جو کسی غیور و باحیث قوم کے شایانِ شان نہیں۔ کسی انسان یا قوم کے جذبہ مروجیت کی شدت اور پستیِ اخلاق کی انتہا اس وقت ہوتی ہے جب وہ مراہنت یا تلقن (خوشامد) اختیار کر لے۔ جس فرد یا قوم میں غیرتِ نفس اور حیثیتِ ذات کی ذرا سی رتق بھی باقی ہو وہ جان تک دیدینا گوارا کرے گی لیکن مراہنت اور خوشامد جیسی ذلیل حرکت پر نہیں اترے گی۔ ہمیں انتہائی قلق اور شدید رنج سے پہنچنا پڑا ہے کہ اس باب میں ہندوستان کے مسلمانوں نے بالعموم نہایت بالواس کن روش کا ثبوت ہم پہنچایا ہے۔

ہاتھ اندھی کی موت پر انسانیت کا تقاضا تھا کہ ہم انہی پر سایہ قوم کے غم میں شریک ہوتے

اور ان سے اظہارِ ہمدردی کرتے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں نے اس موقع پر بالعموم جو خوشامدانہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے اور اس باب میں جو کچھ انہوں نے کیا یا کہا ہے، اس کی توقع شاید ہندو بھی ان سے نہ رکھتے ہوں۔ مثلاً ہر فروری کے ہندوستان ٹائمز میں یہ خبر شائع ہوئی۔

دہلی کے مسلمانوں کی خواہش ہے کہ ہاتھانگا ندھی کے شایانِ شان ایک یادگار قائم کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی مقدس راکھ میں سے کچھ انہیں بھی دی جائے۔ وہ اس راکھ کا ہندوستان کی مقدس ترین عمارت جامع مسجد کے قریب مقبرہ بنائیں گے۔

دہلی بلدیہ کے رکن مشرا ایس۔ ایم عبداللہ نے کہا ہے کہ گاندھی جی ہندوستان کی یونین میں مسلمانوں کے تحفظ کے بالخصوص ذمہ دار تھے اور مجھے افسوس ہے کہ ہم (مسلمان) ان کی زندگی میں ان کی کاہقہ اتباع نہ کر سکے۔

جامع مسجد کے قرب میں ایک غیر مسلم کی راکھ کا عظیم المرتبت مقبرہ! اور اس پر اظہارِ تاسف کہ گاندھی جی کی زندگی میں مسلمان ان کی کما شیخی اتباع کیوں نہ کر سکے!!

۱۲ فروری کے اسٹیٹس میں یہ خبر شائع ہوئی۔

گاندھی جی کی وفات کے بعد پہلے جمعہ کو جامع مسجد میں ایک ہزار سے زائد غریب مسلمانوں کو کھانا کھلایا گیا (بداہتاً بغرض ایصالِ ثواب! طلوعِ اسلام)۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ تقریب اسلامی شریعت کے اس حکم کے مطابق منائی گئی جس کی رو سے کنبہ کے عزیز ترین فرد کی موت پر پہلے جمعہ کو غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تقریب ۱۴ سوں کو بھی منائی جائیگی اور اس کے بعد ۱۲ فروری کو بھی جب گاندھی جی کی خاکستر پر یادگ کے منقار پر لگا، جناح کے مقدس اتصال میں بہائی جائے گی۔

معلوم ہوا ہے کہ دہلی کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ۱۲ فروری کو ہاتھانگا ندھی کی راکھ کا جلوس نکالا جائے اور اُسے جامع مسجد کے سامنے، حضرت ہرے بھرے کے مزار کے متصل دفن کیا جائے۔

۱۷ فروری کے بندرہستان ٹائمز میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی۔

مسلمان ہند نے فیصلہ کیا ہے کہ جامع مسجد کے متصل جہاں گاندھی جی کی مقدس راکھ دفن کی جائے گی، اس لاکھ روپے کے خرچ سے ایک نہایت شاندار مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ اس غرض کے لئے، لال قلعہ کے سامنے، ایڈورڈ پارک کے قریب، ایک ہزار مربع گز زمین کا ٹکڑہ حاصل کیا جائے گا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جہاں گاندھی جی کی راکھ دفن کی جائے گی اس پر مسلمان ہند کی طرف سے ایک مقبرہ بھی تعمیر کیا جائے گا۔ اس مقبرہ کی دیواروں پر چار زبانوں میں ہندی، اردو، عربی اور فارسی میں گاندھی جی کی تعلیم کو کندہ کیا جائے گا۔ مقبرہ کی عمارت، ہندوؤں اور مسلمانوں کے فن تعمیر کا مشترکہ نمونہ ہوگا۔

جمیٹ اعمار کے ارباب بست و کشاد پُر امید ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اس

مقبرہ کی تعمیر کے لئے دل کھول کر چہرہ دیں گے۔

یہ تو ہوا مقدس راکھ پر مقبرہ تعمیر کرنے کے متعلق جس پر گزیدہ ہستی کی یہ مقدس راکھ ہے اس کی شان میں حمد و ثنا کے جو نغمے گائے جا رہے ہیں، ان کی بھی کچھ مثالیں سُن لیجئے۔

اجبار صدق کے مدبر قرآن کے منفسر، جناب عبدالماجہ صاحب دریا آبادی ارشاد فرماتے ہیں۔

گاندھی جی عقیدہ کے لحاظ سے نیم مسلمان ضرور تھے۔ وہ خدا کی وحدانیت اور سرور کائنات

کے مشن پر اعتقاد رکھتے تھے۔ اور کلام مجید سے ان کو بے حد شغف تھا۔ وہ اسلام کے اصول

جمہوریت اور مساوات کے دلدادہ تھے۔ (بحوالہ اجبار جنگ ۲۰۰۸ء)

جی! خدا کی وحدانیت پر اعتقاد رکھتے تھے اور عمر بھر رام اور سیتا (میاں بیوی دونوں) کی

پرستش کرتے رہے تھے۔ سرور کائنات کے مشن پر ایمان رکھتے تھے اور سرور کائنات کے نام پر امت (قوم)

۱۷ گاندھی جی ہر شام جو ہر تمنا کیا کرتے تھے وہ یہ تھی۔

رگھو تپ راکھو راجہ رام۔ قیمت پاون سیتا رام

رگھو خاندان کے باعث فخر، بہا راجہ رام چندر اودان کی بیوی سیتا، بڑے غریب نواز تھے

بننے کی مخالفت کرتے تھے۔ کلام مجید سے انھیں شغف تھا اور اردو کی اس لئے مخالفت کرتے تھے کہ وہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اسلام کے اصول جمہوریت کے دلدادہ تھے اور انسانوں کی تقسیم وطن کی جغرافیائی حدود کی رو سے کرتے تھے۔ اور غیر مسلموں کی تو ایک ہی رہی۔ معلوم نہیں کہ یہ گاندھی جی کی مدح ہوئی یا قدح۔ اس لئے کہ قرآن کی رو سے ایک شخص یا مسلمان ہو سکتا ہے یا غیر مسلم۔ نیم کافر اور نیم مسلمان کا مجموعہ وہی ہے جس کے متعلق قرآن نے فرمایا ہے کہ اَفْتُونَن بَعْضُ الْكُتَابِ وَتَكْفُرُونَ بَعْضُ (یعنی کتاب خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھنا اور ایک حصہ سے انکار کرنا۔ اور جس غرض کے لئے اس قسم کی روش اختیار کی جاتی ہے۔ قرآن نے اس کی بھی تشریح فرمادی ہے کہ اُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ (یعنی یہ روش وہ اختیار کرتے ہیں جن کے پیش نظر خدا پرستی، حیاتِ اخروی) نہیں ہوتی بلکہ محض دنیاوی مقاصد ہوتے ہیں اور ان مقاصد کے حصول میں اس قسم کی روش مدد و معاون ہوتی ہے۔

خیزہ جملہ معترضہ تھا۔ ہم کہہ رہے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان اس مدانیت و تملق کی بنا پر گاندھی جی کی تعریف و توصیف میں کس حد تک بڑھ رہے ہیں۔ ۵ فروری کے اسٹیشن میں کسی صاحب (اے۔ ایم۔ جسنی) کا خط چھپا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔

ہاں تا گاندھی، ایک بہت بڑا ہندو ہونے کے ساتھ ساتھ، اسلام کے نصب العین اور فلسفہ پر بھی پورے اترتے تھے۔

ایک صاحب ہیں عبدالرحمن خاں۔ وہ ۱۹ فروری کے ہندوستان ٹائمز میں رقم طراز ہیں۔ اگر میں یہ عقیدہ نہ رکھتا کہ نبوت، محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ختم ہو گئی ہے تو میں یقیناً گاندھی جی کو بیسویں صدی کا پیغمبر کہتا۔ حضرت ہاتا گاندھی (یہ الفاظ انہی کے ہیں۔ طلوع اسلام) ایک ہندو تھے لیکن ان کی ہندو ازم تنگ نظری کی نہیں تھی۔ وہ اپنی تعلیم کو پیدا اور گیتا کی پاکیزہ اور غیر محرف آسمانی وحی سے اخذ کیا کرتے تھے۔ . . . کہئے کہ اگر ہم

لے مئی سست گواہ چت۔ خود ہندو متیقن کے نزدیک بھی وہاں گیتا غیر معروف نہیں ہیں۔

اپنے ہر وار و شہید حضرت ہاتھ گا ندھی کی اتباع دیکریں تو اور کس کی اتباع کریں۔

یعنی اگرچہ نبوت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی لیکن اتباع اُن کی نہیں، حضرت ہاتھ گا ندھی کی کی جائے گی۔ معلوم نہیں اگر اتباع گا ندھی ہی کی کرنی ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت جاری ہے فائدہ کیا ہے؟ خیر۔ انھوں نے پھر جو چاہتے تھے اور کچھ شرانے شرانے کہا ہے۔ ایک صاحب میر شتاق احمد اُن سے بھی آگے بڑھے ہیں اور انھوں نے برملا کہہ دیا ہے کہ

گا ندھی جی کی عظمت، مکان و زمان کی حدود سے ماوراء ہے، یہ محبت و سلامتی کا پیغمبر، اپنی

عظمت میں برہ، عیسیٰ اور محمد سے بھی بڑھ گیا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز، ۱۸)

انا لله وانا اليه راجعون۔

ہم نے جس طرح سینہ پر پتھر رکھ کر ان اقتباسات کو درج کیا ہے اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ ہم نے اس بحث کو طنز نہیں چھیڑا۔ اس سے ہمارے جگر کے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ یہ وہ مقیاس ہے جس میں ہم اپنی قوم کی پستی دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں ہمیں ان کی کانپتی ہوئی روہیں، قوت کے سامنے انتہائی تعبد و تذلل سے سجدہ ریز نظر آ رہی ہیں۔ مسلمان کا مقام تو خیر بہت بلند ہے۔ اس قسم کی چالوسی تو انسانیت کی عام سطح سے بھی گری ہوئی ہے۔ مسلمان، اس قدر ذلیل تو اپنی سلطنت چھین جانے کے بعد انگریزوں کی عمل داری میں بھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے انگریزوں کے سلاطین کی تعریف ضروری کی۔ ان کے حسن انتظام کی مدح و ستائش میں قصیدے بھی لکھے۔ لیکن ان کے مشاہیر و باطل کو ایسا مرتبہ تو کبھی نہیں دیا۔ بلکہ حق تو یوں ہے کہ عین جن زمانہ میں انگریزوں کا اقتدار سلط ہو رہا تھا اور مسلمان بری طرح سے کچلے جا رہے تھے، وہی زمانہ تھا جب مسلمان عیسائی مبلغین کے خلاف کھلے بندوں مناظرے اور جھڑپیں کرتے تھے۔ قادیانی نبوت نے (کہ جو مسلمانوں کی مرعوبیت و قنوطیت کی ایک یاس انگیز تصویر تھی) انگریزوں کو اولی الامر منکم (تم میں سے صاحبان اختیار) کہہ کر ان کی اطاعت کو منصوص قرار دینے کی کوشش ضروری کی تھی۔ لیکن وہ تو، خود انہی کے الفاظ میں، انگریزوں کا "خود کا شستہ پودا"

۱۔ توہیت پرست مسلمان اسی زمرہ میں شامل ہیں کہ جس غرض کیلئے انگریز نے قادیانی نبوت کو ابھارا تھا اسی مقصد کیلئے ہندوستان کی پریشانی

تھی۔ ہذا وہ مسلمانوں کی ترجمان نہیں کہلا سکتی۔ اس لئے یہ امر موجب صد تاسف و تعجب ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے شروع ہی میں اس درجہ مہانت اختیار کر لی۔ اگر یہی لیل و نہار میں تو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد آپ انھیں زنا پرورش و قشقہ بر جیں، اس انداز سے ڈنڈوت کرتے دیکھیں گے کہ — تاکس نگوید بعد ازین من دیگرم تو دیگری — یہ جو بیسوں باہر سے آنے والی قومیں، آج ڈھونڈے سے بھی کہیں نہیں ملتیں اور اس اکال الامم (ہندوویت) کا جزو بن چکی ہیں ان کے ساتھ ہی کچھ ہوا تھا۔ انہی کا رام ان کا خدا بن گیا اور اتہی کا راون ان کا رکشس قرار پایا گیا۔ اب ان میں اور ان میں کوئی فرق ہی محسوس نہیں ہوتا، حتیٰ کہ انھیں یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کبھی اپنا الگ قومی تشخص بھی رکھتی تھیں۔ یہی ہندو کا مقصد تھا جس کے لئے وہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی اس قدر شدت سے مخالفت کرتا رہا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے جو کچھ اوپر درج کیا ہے وہ چند افراد کے افعال و اعمال ہیں، ہندوستان کے تمام مسلمان ان کے ہم نوا نہیں ہیں۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کا اس باب میں سکوت بھی کوئی عمدہ شگون نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کراچی میں بیٹھ کر یہ کچھ کہہ لینا آسان ہے۔ ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں یہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بعینہ ہی چیز ہے جس کی طرف اس تمام بحث سے توجہ معطف کرنا مقصود ہے۔ یعنی یہ کہ نامساعد حالات میں حق گوئی و بے باکی، یہی قوتِ ایمانی ہے۔ ہم نے ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق جب یہ کچھ لکھا ہے تو اس سے یہ مفہوم نہیں پاکستان کے مسلمان قوتِ ایمانی میں ان سے بہت آگے ہیں۔ یہ وہاں ہوتے تو یہ بھی یہی کچھ کرنے۔ لیکن اس سے اصل حقیقت تو اپنی جگہ رہتی ہے، یعنی یہ کہ کسی قوم کا نامساعد حالات میں تعلق پیشگی اختیار کر لینا اور مہانت پر اتر آنا، اس قوم کی فنا آمدگی کی دلیل ہوتا ہے۔ ہماری اس تنقید سے مقصود ہندوستان کے مسلمانوں کی تنقیص و تحقیر نہیں، ان کی تنقیص خود ہماری تنقیص ہے۔ یہ تو ایک دکھے ہوئے دل کی پکار ہے اور مقصود اس آہ و نالہ سے فقط یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر اس حقیقت کو بالکل واضح اور غیر مستتر کر دیا جائے کہ ان کی زندگی کا راز کس مسلک میں ہے۔ جیسا کہ ہم نے سابقہ اشاعت

میں لکھا تھا، ان کے لئے صحیح راہ عمل یہی ہے کہ وہ ہندوستان کی حکومت سے رفاہ عامہ اور فلاح و بہبود انسانی کے تمام کاموں میں تعاون کریں۔ امن قائم رکھنے اور فساد مٹانے میں ہر ممکن کوشش کریں۔ شرافت اور دیانت کا ہر وقت پاس رکھیں۔ خواہ مخواہ کی ہنگامہ آرائیوں سے اپنی قوت زائل نہ کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہ اپنی حیات اجتماعیہ کے قیام و بقا میں کوتاہی نہ کریں اور اپنے مخصوص تصورات زندگی کی نگہداشت کریں۔ خوف کو قطعاً پاس نہ پھینکنے دیں کہ خوف سے بے یقینی پیدا ہوتی ہے اور بے یقینی سے قوموں کی موت واقع ہوتی ہے۔ اپنی خودداری اور حمیت کو کسی قیمت پر بھی ہانپنے سے نہ جانے دیں کہ باغیرت اور خوددار قوم کو دنیا سے کوئی نہیں ٹا سکتا اور غیرت و حمیت کو بیچ کر زندہ رہنا، زلت اور لعنت کی زندگی ہے جس سے باعزت موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ زندگی صرف سانس لینے کا نام نہیں۔ یہ توجیوانیت کی بہت ترین شکل ہے۔ زندگی غیرت اور عزت کی زندگی کا نام ہے۔ اگر یہ محفوظ ہے تو سب کچھ محفوظ ہے اور اس کے تحفظ کا راز ہمارے ایمانِ محکم اور عزمِ راسخ میں مضمر ہے۔ اپنے عزم و یقین کی کمزوری و حقیقت غیروں کی قوت ہوتی ہے، کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ

جاں بازو سٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے



اشاعتِ مابقی میں ہم نے "سندھی اور غیر سندھی" کے دلخراش سوال پر اپنے دل درد مند کی چند صدیوں کو اربابِ سندھ تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ ہمیں توقع تھی کہ اس کے بعد یہ داستان الم انگیز ختم ہو جائے گی۔ لیکن افسوس ہے کہ پھر ایسے واقعات منصہ شہود پر آگئے جن کی بنا پر ہمیں اس حدیثِ جگر تڑو کو اس مرتبہ پھر دہرانا پڑا، جو چند صفحات بعد آپ کی نگاہوں سے گزرے گی۔

ہم ایک دن بانار سے گزر رہے تھے کہ دیکھا کچھ نوجوان جلوس کی شکل میں گزر رہے ہیں، اور نعرے لگا رہے ہیں کہ "سندھ ہمارا ہے" دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اراکین ہیں۔ اس پر کھجہ سے اک ہوک کیا انھی کی اللہ! یہ مسلمان کہہ رہا ہے ہیں۔ ہم اپنے ان بھولے نوجوانوں سے گزارش کریں گے کہ آپ اپنی نگاہوں کو اس قدر تنگ کیوں کر رہے ہیں۔ اللہ نے آپ کو بہت

بڑی وسعت زمینوں کا مالک بنا دیا ہے اور آپ ہیں کہ اپنے آپ کو ابھی تک سندھ کی چار دیواری میں محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

کیا آپ کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ صرف سندھ ہی آپ کا نہیں بلکہ اللہ کے فضل و احسان سے اب تو بلوچستان بھی آپ کا ہے، پنجاب بھی آپ کا ہے، صوبہ سرحد بھی آپ کا ہے اور مشرقی بنگال بھی آپ کا ہے۔ آپ اپنی نگاہوں کو وسعت کیوں نہیں دیتے۔

تو اسے شرمندہ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

اللہ آپ کو ایسی وسعتیں عطا کر رہا ہے اور آپ ہیں کہ ابھی تک سندھ کے صحراؤں میں گھرے رہنا چاہتے ہیں۔ ان نادانوں کی غفلت پر غور کیجئے۔ اللہ ان کو آسمانوں کی بلندیوں تک لے جانا چاہتا ہے و لٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلٰى الْاَرْضِ (پچھ) اور یہ ہیں کہ زمین کی پستیوں سے چٹے رہنا چاہتے ہیں۔

ہم سندھ کے اربابِ حل و عقد سے، عجز و انکساج در خواست کریں گے کہ وہ خذرا اس قضیہ نامرضیہ کو ختم کرانے کی کوشش کریں۔ اگر انھیں مرکزی حکومت کے کسی فیصلے یا ارادے سے اختلاف ہے تو اُسے آئینی طور پر طے کرانے کی سعی کریں۔ اس طرح کی ہنگامہ آرائیاں ہماری سب کی رسوائیوں کا موجب ہیں۔ و فیہا عبرة لاولی الالباب۔

اشاعتِ رواں میں، جن صفحات بعد "حاسبہ نفس" کے عنوان سے جو مقالہ آپ کی نظر سے گزرے گا اس میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ قوموں کی زندگی میں صحیح تنقید کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہمارے نزدیک اب مسلم لیگ کی یہ حیثیت ہونی چاہئے کہ وہ حکومت کے عزائم و اعمال پر عتاب دنگاہ رکھے اور اس امر کا جائزہ لیتی رہے کہ حکومت پاکستان کا قدم جادۂ حق و صداقت سے ہٹنے نہ پائے۔ وہ مقالہ پریس میں جا چکا تھا کہ خبر آئی کہ لیگ کی کونسل نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کی

تفکیلی نوین ارکان حکومت، لیگ کے عہدیدار نہ بن سکیں۔ یہ فیصلہ ایسا مبارک اور یہ اقدام اس قدر مستحسن ہے کہ اس پر اظہار خیال کو آئندہ اشاعت تک اٹھا رکھنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

یہ ظاہر ہے کہ پاکستان کی حکومت، قوم کی حکومت ہوگی (اس میں شبہ نہیں کہ ہماری موجودہ حکومت قومی حکومت نہیں کہلا سکتی۔ لیکن یہ محض عبوری دور کے لئے عارضی انتظام ہے۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے آئین جدید میں تفکیلی حکومت کے لئے جو انداز متعین کیا جائے گا۔ اس کی رو سے حکومت قوم کی صحیح نمائندہ ہوگی۔ اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہوگا تو وہ حکومت مستبد آمرانہ ہوگی جو قوم کے لئے غلامی کی بدترین صورت ہوگی) پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ حکومت، جذباتی دماغوں کے فیصلوں سے ترتیب پاتی ہے اس سے کئے انکار ہو سکتا ہے کہ حین نیت اور خلوص عزائم کے باوجود، انسانی دماغ سے بہر حال غلطی کا امکان ہے اور چونکہ انسان اپنے اعمال پر خود تنقید نہیں کر سکتا، اس لئے اس کے لئے یہ دیکھنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کہاں غلطی کر رہا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایک کے اعمال کا جائزہ لینے والا کوئی دوسرا ہو۔ اسی کو تنقید صاف کہتے ہیں جس کے بغیر کوئی نظام حکومت مستحکم و مرتفع نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے دنیاوی نظام جمہوریت میں 'حزب مخالف' (Opposition Party) کے وجود کو ناگزیر سمجھا گیا ہے۔ لیکن ان حکومتوں کے حزب مخالف، اور قرآنی نظام کی جماعت محاسب میں ایک بہت بڑا اصولی فرق ہے۔ ان حکومتوں میں حزب مخالف نام ہوتا ہے اس جماعت کا جو انتخاب میں شکست کھا جانے کی وجہ سے اپنی حکومت مرتب نہ کر سکے۔ اور اکثریت کی قائم کردہ حکومت کے مقابلہ میں، ایک فریقی مخالف کی حیثیت سے صف آرا ہو جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حکومت، اس فریقی مخالف کی تنقید و مخالفت کے خوف سے ایسے عزائم و اعمال سے اجتناب رہنے کی کوشش کرتی ہے جس پر اٹھی اٹھائی جا سکے اور اس طرح وہ ناقصے زمام نہیں ہونے پاتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس اصلاح کا جذبہ محرکہ تخیلی و تریبی ہو، اس کا نتیجہ آئین و ضوابط کی لفظی پابندی تو ہوتی ہے، شرف انسانیت کی بالیدگی نہیں ہو سکتی، ایسے ہی جس طرح خوفِ پاسبان سے، چوری سے اجتناب، شرافت و سعادت کا موجب نہیں بن سکتا۔ قرآن، اس احتساب و تنقید کیلئے

تو اسی بات کو کا عدیم النظیر انداز اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یعنی ایک دوسرے کو حق و صداقت سہرا قائم رہنے کی تلقین کرنا۔ اس اندازِ محاسبہ میں یہ نہیں ہوتا کہ ایک جماعت کا مستقل فریضہ کام کرنا ہو اور دوسری جماعت کا مستقل منصب تنقید و تنقیص۔ نظامِ قرآن میں، جماعت میں تقسیم کار کے ساتھ ساتھ اشتراکِ فرائض بھی رہتا ہے اور جماعت کے ارکان ایک دوسرے کے مدد و معاون اور محاسب و ناقد بھی ہوتے ہیں۔ لہذا اس نظام میں حزبِ حکومت اور حزبِ مخالف، دو الگ الگ مستقل بالذات پارٹیاں نہیں ہوتیں۔ ایک ہی جماعت، تقسیم عمل کی رو سے، نظم و نسق حکومت کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے اور تبشیر و تنذیر کا بارِ عظیم بھی اٹھاتی ہے۔ اور پھر اس جماعت کے جملہ افراد، ایک دوسرے کے اعمال کا جائزہ بھی لیتے ہیں۔ اور باہم گرتو صیہ حق و صداقت کا اہم فریضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ (ہم اس وقت اس مسئلہ کے متعلق صرف چند اجالی اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس کی جزئیات کے متعلق پھر کبھی بحث کریں گے۔ انشا اللہ)

ہمارے ہاں صورت یہ پیدا ہو رہی تھی کہ حکومت مسلم لیگ کی تشکیل کردہ تھی، لیکن وہی لوگ اراکین حکومت تھے اور وہی اربابِ لیگ۔ اس سے خدشہ تھا کہ خود مسلمانوں میں سے ہی ایک اور فریق پیدا ہو جائے جو حزبِ مخالف کی حیثیت اختیار کر جائے اور اس طرح قوم میں تشتت و افتراق کا موجب بنے۔ اسی خدشہ کے پیش نظر ہم چاہتے تھے کہ مسلم لیگ اربابِ حکومت کے اعمال و عزائم کے متعلق محتسب و ناقد کی حیثیت اختیار کر سکے۔ تاکہ کسی حزبِ مخالف کی ضرورت باقی نہ رہے۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکتا تھا جب تک تقسیم عمل کے اصول کے مطابق، ارکانِ حکومت، اربابِ لیگ سے

لہ والعصران الانسان لفی خسر۔ الا الذین امنوا و عملوا الصالحات۔ و تو اصبوا بالحق و تو اصبوا بالصبر۔ زمانہ اس حقیقت کبریٰ پر شاہد ہے کہ انسان (اپنے عزائم و اعمال کے نتائج میں) نریاں کار رہتا ہے۔ بجز اس جماعت کے جو اپنے ارادوں کی بنیادِ خدا (کے قانونِ مکافات) کے ایمان پر رکھے اور ایسے کام کرے جو اس میں زندگی کی سرفرازیوں کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ اور ان کا نظامِ عمل یہ ہو کہ وہ ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین کرتے رہیں۔ یہ آئیہ جلیلہ قوموں کے عروج و زوال اور انسانیت کے ترفع و تسفل کے متعلق ایک عظیم القدر اصول پیش کرتی ہے جس کی تشریح کسی دوسرے موقع پر کی جائے گی۔ (بیدہ التوفیق)

الگ نہ ہوں۔ میں خوشی ہوئی کہ لیگ کونسل نے اپنے اس فیصلہ سے کہ آئندہ 'عمالِ حکومت میں سے کوئی شخص' لیگ کا عہدیدار نہ ہو سکے گا، ایک طرف تشمت و افتراق کے اس خطرہ کو بھی مٹا دیا اور دوسری طرف نظامِ حکومت کی اصلاح و استحکام کی طرف بھی نہایت مبارک قدم اٹھایا۔ لیگ چونکہ ملت کی ترجمان ہے۔ لہذا اب حکومتِ ملت کے تابع ہوگی نہ کہ ملت حکومت کے تابع۔ اور یہ تبدیلی ایک نہایت خوش آئند اختلاف کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس فیصلہ سے مسلم لیگ کی مندرجات 'قائدِ اعظم جیسی بلند مرتبت ہستی سے محروم ہوگئی' لیکن یہ حیران، محض اصطلاحی ہوگا، معنوی نہیں ہوگا۔ لیگ 'قوم' قائدِ اعظم کے مشوروں سے بدستور مستفیض ہوتی رہے گی۔

باقی رہی جناب قائدِ اعظم کی ذاتِ گرامی۔ سوان کی عظمت اس قدر بلند اور ان کا احترام قلبِ ملت میں اس درجہ گہرا بجا چکا ہے کہ وہ مناصب و مدارج سے مشروط نہیں رہا۔ وہ اب اس حقیقت کی شہود مثال ہیں کہ — صدر رہ جا کہ نشینہ صدارت۔



اب مسلم لیگ کے لئے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ ہماری دس سالہ جدوجہد میں، لیگ کی حیثیت ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک فریقِ متخاصم سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ صورت یہ تھی کہ ایک نہایت قابل اور دیانتدار وکیل تھا جو دنیا کی عدالت میں، ملتِ اسلامیہ کا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ اسے ضرورت فقط اتنی تھی کہ جب قوم سے کسی عدالت کی طرف سے پوچھا جائے کہ یہ تمہارا وکیل ہے اور تم نے اسے مختار نام لے رکھا ہے تو وہ کہدے کہ بیشک! لہذا، اربابِ لیگ کے ذمے، اس سر بلا دینے کے علاوہ، اور کوئی کام نہ تھا۔ بنا بریں لیگ کے مناصب و مدارج کے لئے، معیار انتخاب اتنا ہی تھا کہ وہ شخص اتنی مالی حیثیت رکھتا ہے کہ "عدالتوں" میں حاضری کے لئے، خرچہ نہ طلب کرے۔ اس خرچ کے معاوضہ میں جو امتیازی شان مل جاتی تھی وہ یقیناً ہنگی نہ تھی۔ لہذا، لیگ کی سیادت و قیادت، ان اربابِ دولت و حشمت کے لئے بالعموم ذہنی عیاشی سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ انھیں عوام سے کوئی ربط تھا نہ ان کے احوال و کوائف کی کچھ خبر۔ نہ ان کے دل میں قوم کا کوئی درد تھا نہ اس درد کے مداوی کی کوئی فکر۔ اقلیت کے

صوبوں میں، پھر بھی ان لوگوں کو ہندوؤں کی بالادستی کے خلاف، کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اکثریت کے صوبوں میں تو عام طور پر نوابی ٹھکانے، تنہا نتیجہ اس کا یہ تھا کہ یہ اکابرین، برف کی سلوں کی طرح، ملت کے قوائے عملیہ کو مغلوب کئے ہوئے تھے۔ لہذا الحمد کہ پاکستان کے آفتابِ چہانتاب کی حرارت نے ان سلوں کو گھسلا دیا ہے۔ چنانچہ اب، عہدِ کین کی مسلم لیگ کی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں۔ اب ہر جگہ، ابتدائی لیگ سے لیکر ہائی کمانڈ تک، نئے انتخابات ہوں گے۔ اب قوم کے نئے وقت ہے کہ وہ اٹھے اور نہایت مناسب اور موزوں شخصیتوں کو منتخب کر کے لیگ کی زمام اختیاران کے ہاتھ میں دے۔ اگر قوم نے اپنی اس ذمہ داری کا احساس کر لیا اور انتخابِ جدید، صحیح خطوط پر عمل میں لایا گیا تو لیگ ایک زندہ اور زندگی بخش جماعت بن جائے گی۔ لیکن اگر قوم نے اس باب میں بے اعتنائی اور بے رغبی، یا تاہل و تغافل شکاری اختیار کی، تو اس کے بعد، پھر وہی اکاس بیل، ان کے شجرِ ملی پر چھایا جائے گی، جس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ درخت کی تمام رطوبتوں کو چوس کر خود سرسبز و شاداب رہتی ہے اور درخت بے چارہ جڑوں تک کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ جدید انتخاب میں، معیارِ فضیلت جو ہر ذاتی، قوتِ عمل، اور اتباعِ آئینِ خداوندی ہو، نہ کہ قاعدیت کی مرہا یہ داریاں اور ہامانیت کی دسیہ کاریاں۔

ہمیں لیگ کے اس فیصلہ سے البتہ اصولی اختلاف ہے کہ لیگ کی تنظیم جدید، ایک شخص کے ذمہ ڈال دی جائے۔ چاہے تھا کہ اس مقصد کے لئے ایک مجلسِ تنظیمی مرتب کی جاتی تاکہ ان سب کی متحدہ مساعی سے یہ کام جلد از جلد سرانجام پا جاتا۔ کام بہت زیادہ ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہو گا کہ اگر اس میں عجلت برتی گئی تو وہ ادھورارہ جائے گا اور اگر اس کی تکمیل کی فکری گئی تو اس میں بہت زیادہ وقت لگ جائے گا۔ اور دونوں صورتیں بے حد ضرورساں ہیں۔ بہر حال، اب لیگ کے فعال طبقہ کو چاہئے کہ از خود آگے بڑھے اور اس تنظیم نو کو جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچا دے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ لیگ کی تشکیلِ جدید بھی مجلسِ آئین سازی کی طرح، اصحابِ کھف کا غار بن کر رہ جائے جن کے متعلق فرمایا ہے کہ تحسبہم ابقا ظاہم ہر قودہ۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

مسلمانان ہند پر العموم اور مسلمانان پاکستان پر بالخصوص، علامہ اقبال علیہ الرحمہ کا جس قدر احسان ہے اس کا ہر قلب سلیم اندازہ کر سکتا ہے۔ صدیوں سے مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ ترس گئے تھے کسی مردِ راہِ داں کے لئے۔

اور بیسویں صدی کے اوائل سے تو کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ بیچانتا نہیں ہوں ابھی راہِ بسر کو میں
اس آوارگی، فکر و نظر اور انتشارِ سعی و عمل کا نتیجہ تھا کہ ان کی کوئی تحریک بار آور اور کوئی حرکت
بروز نہ نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ جب کسی راہِ رو کے سامنے منزل ہی متعین نہ ہو تو اس کا سفر سوائے مکان
پیدا کرنے کے اور کیا نتیجہ مرتب کرے گا۔ پریشانی و سرانگی کا یہ عالم تھا کہ اس مردِ دانے، جسے فطرت کی
گہر بارہوں نے متلع فرست ایمانی اور دانش نوری سے نوازا تھا، ان کی بھولی ہوئی منزلوں سے انھیں
پہرے آٹا کرایا۔ کہیں انھیں بتایا کہ ان کے ہاں قومیت کا مدار نسلی اشتراک نہیں بلکہ رشتہ دین ہے،
اس اعتبار سے

خاص ہے ترکیب میں، قوم رسولِ ہاشمی (۱۹۱۲ء)

کہیں انھیں یاد دلایا کہ جغرافیائی وحدت، انسانوں کی خود ساختہ اصطلاح ہے۔ عظمتِ انسانی
سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے (۱۹۱۲ء)

اب اس طرح انھیں ان ستاروں کے نقوش دکھاتے دکھاتے ۱۹۱۲ء میں اس مقامِ محمود تک لے آئے جو

ان کی جدوجہد کا نتیجہ اور ان کے سعی و عمل کا قبلہ تھا جہاں انہوں نے فرمایا کہ

مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی سلطنت کا قیام

کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ (سن ۱۹۴۳ء)

یہی تھے وہ نشاناتِ راہ جو مسلمانانِ ہند کی نشاۃِ ثانیہ میں ان کے لئے دلیلِ منزل بنے اور وہ رفتہ رفتہ

۱۹۴۷ء میں ایک آزاد مملکت کے مالک بن گئے۔ وکذا اللہ یحیی اللہ الارض بعد موتھا۔ کہئے کہ کسی قوم

پر اس بے بڑا احسان کچھ اور ہو سکتا ہے؟

۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلمانانِ ہند دوسروں کی غلامی میں تھے اس لئے وہ اپنے اس

محسنِ اعظم کی یاد سوائے انفرادی تقاریر کے اور کسی صورت میں نہیں مناسکتے تھے۔ حصولِ پاکستان کے

بعد سب حساس قلوب کی نگاہیں بابِ حکومت کی طرف لگ رہی تھیں کہ دیکھیں، وہ اب اس بانیِ تصور

پاکستان کی یاد کس موزونیت سے مناتی ہے۔ یہ نگاہیں ہر بار حکومت کے عتبہِ عالیہ تک جاتیں لیکن

حسرت بن کر حساس قلوب میں لوٹ آتیں۔ حتیٰ کہ حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ ۱۹۴۷ء میں کس کس

تقریب میں حکومت میں تعطیل منائی جائے گی۔ ان نگاہوں میں غصہ بڑی سی چمک پیدا ہوئی کہ خیر! اب تو

کچھ اشکِ شوقی کا پہا نہ مل جائے گا۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ اس

فہرست میں اور سب تقاریر پر تعطیل کا ذکر موجود ہے لیکن اگر موجود نہیں تو اس کا ذکر جس نے انہیں

پاکستان کا تصور عطا کیا تھا!

زنگل فروشِ نالام کز اہل بازار راست تپاکِ گرمی رفتار باغبانمِ سوخت

تعجب بالائے تعجب کہ اس فہرست میں بسنتِ پنجی، شورا تری، ہولی، جنمِ اشٹمی، دسہرو، دیوالی،

حتیٰ کہ گورو گو بند سنگھ کے یومِ پیدائش تک کی تعطیلات تو موجود ہیں لیکن اقبال کے یومِ وفات کا کس ذکر نہیں

اقبال تو اپنے زندگی بخش پیغام کی بنا پر زندہ جاوید ہے۔ وہ اس کا محتاج نہیں کہ اس کی یاد

منائی جائے۔ اس کی یاد سے یہ قوم اپنی زندگی اور جذبہِ احسانِ شناسی کا ثبوت ہم پہنچا سکتی تھی۔ لیکن

انسوس کہ اس نے بڑی احسان فراموشی کا ثبوت دیا!

۲۱ اپریل کو اقبال کا یوم وفات ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر حکومت پاکستان کو اپنی اس فروگذشتہ کا احساس ہو گیا ہو تو اس کے کفارہ کی بہترین صورت یہ ہے کہ یوم اقبال کی تقریب کو سرکاری طور پر منایا جائے اور صرف اسی سال نہیں، بلکہ اس یادگار کو مستقل طور پر قائم رکھا جائے۔ اس منصور ہو گا کہ پاکستان کے سامنے وہی نصب العین ہے جسے اقبال نے پیش کیا تھا۔ اور اقبال کا پیش کردہ نصب العین اس کے سوا اور کونسا ہے جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ فہل من مدکر۔

(۲)

حکومت پاکستان نے جب اپنے دفاتر کو کراچی منتقل کیا تو ہر چند دیگر اہم و اشد ضروریات کے پیش نظر، عمارات اور ان سے متعلق ساز و سامان پر اخراجات میں انتہائی کفایت کی گئی، لیکن بائیں ہمسے دفاتر اور متعلقین دفاتر کی روزمرہ کی ضروریات کے لئے مناسب انتظامات کرنے ہی پڑے۔ دفاتر کے لئے کچھ نہ کچھ عمارات بھی بنوانی پڑیں۔ فرنیچر اور دیگر سامان و براق کچھ مستعار لیا کچھ خریدا گیا۔ عملہ کی رہائش کے لئے مکانات تعمیر کرانے پڑے۔ دفاتر میں عملہ کے لئے ٹھن روم، موٹروں کے لئے گراج، بیرون دفاتر کی ضروریات کے لئے ہسپتال، اسکول، بڑے بڑے حکام کے لئے کونٹیناں، بھگے، کسی نہ کسی طرح یہاں کئے ہی گئے۔ ان سب چیزوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ لیکن اس اسلامی سلطنت میں مسلمان عملہ کے لئے اگر کسی چیز کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تو وہ مسجد تھی۔ دفاتر کے عملہ میں سے جو قدامت پرست اس "نماز تہذیب و تمدن" میں ہنوز عہد کرک کی "رسم نماز" کی پابندی ضروری سمجھتے تھے انہوں نے کسی کو نہ اور گوشے میں اپنے لئے سجد گاہ تجویز کر لی۔ جنہیں ایسی جگہ بھی میسر نہ آئی وہ کسی درخت کے سایے میں جا کھڑے ہوئے۔

آپ ظہر کی نماز کے وقت، دفاتر کی ان عالی شان عمارات میں جا نکلے اور ان کے درخشاں پس منظر میں نمازیوں کے اجتماع کو دیکھئے تو فرط ندامت سے آپ کی نگاہیں زمین میں گڑ جائیں گی۔ آپ دیکھیں گے کسی درخت کے سائے یا دیوار کی اوٹ میں، چند تھپروں سے ایک احاطہ کی نشان دہی کر لی گئی ہو

اس لحاظ کے اندر، فرشی خاک پر چند پوشیدہ چٹائیاں بچھ رہی ہیں اور ان پر یہ متعلقین مملکتِ خدا دادِ پاکستان، اپنے رب کے حضور رکوع و سجود میں مصروف ہیں۔ جن کی چٹائیوں کی خاک اور کپڑوں سے لپٹا ہوا گرد و غبار سنگ مرمر پر بچھے ہوئے ان قالینوں کی یاد دلا رہا ہے جنہیں ابھی ابھی ان کے جوتے مسل کر گئے ہیں۔ اس شان و شوکت اور بزرگی و احتشام کو دیکھے اور پھر اس بے سرو سامانی پر نگاہ ڈالئے اور اس کے بعد — پسینہ پونچھے اپنی جبین سے۔

اراکینِ حکومت اور متعلقینِ مملکت کا اجتماع جمعہ تو ویسے ہی غائب ہو چکا ہے کہ اس دن نصفِ آخر کے لئے دفاتر بند کر دیئے جاتے ہیں۔ ہفتے کے دیگر ایام میں جو نمازیں اوقاتِ دفتر میں آجاتی ہیں ان کے لئے یہ حسنِ انتظام ہے! دفاتر کی عمارت کے درمیان کئی ایک کشادہ میدان پڑے ہیں جن میں تھوڑی سی توجہ سے، سرپرست کسی عمارت کے کھرے کئے بغیر، نمازوں کا اطمینان بخش انتظام ہو سکتا ہے۔ لیکن اربابِ اختیار نے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اور وہ لوگ ہیں جن کی زبانوں سے شریعتِ اسلامی اور قانونِ خداوندی کے تذکرے ہمیشہ زہرِ زہرہ کوثر بار ہوتے ہیں۔ فہل من مداکم۔

معذرت

سابقہ پرچہ میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اشاعتِ زیرِ نظر میں جناب پروفیسر صاحب کا مقالہ "دراشتِ ارضی کا ابدی قانون" شائع کیا جائیگا لیکن ہمیں انسو ہے کہ عدم گنجائش اس کی اشاعت کی راہ میں حائل ہو گئی۔ ہم قارئینِ طلوعِ اسلام سے بدلِ معذرت خواہ ہیں کہ انہیں زحمت کش انتظار ہونا پڑا۔ بتوفیقِ ایزوی آئندہ پرچہ میں یہ مضمون آپ کے سامنے آجائے گا۔

تقسیم ہند کا آئینی پہلو

(قسط اول)

سابقہ اشاعت میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۴ء تک کے واقعات سلسلہ وار بیان کئے گئے ہیں۔ وہ جائزہ بہر نفع ایک سرسری جائزہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں اہم آئینی مسائل پر مفصل تبصرہ کی گنجائش نہیں تھی۔ چونکہ سائل تقسیم اور ان کا آئینی پس منظر تفصیلی بحث کے متقاضی تھے اس لئے عنوان زیر نظر خالصتاً اسی موضوع سے مختص ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۴۶ء میں جو کہا تھا کہ ہندوستان میں دو قوتیں ہیں ایک انگریز کی اور دوسری کانگریس کی۔ تو وہ نعرہ ایک فرد واحد کی شخصی امانیت کا آئینہ دار نہیں تھا بلکہ اس گہری تبدیلی کا پتہ دے رہا تھا جو اس جماعت میں پیدا ہو چکی تھی جس کا وہ صدر تھا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات عامہ میں کانگریس جیسی سرمایہ دار اور منظم سیاسی جماعت کی کامیابی یقینی تھی۔ اس کے مقابلہ میں کوئی منظم جماعت نہیں تھی مسلم لیگ ممکن اور مضمر حریف ضرور تھی لیکن انتخابات میں وہ کوئی معین موقف سامنے رکھ کر مسلمانان ہند کو مجتمع نہیں کر سکی تھی۔ اس کے دورِ جدید کا آغاز تھا کہ معرکہ انتخاب آپڑا۔ اس کے باوجود یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کانگریس کی کامیابی ہندو ووٹوں سے ہوئی، کیونکہ اسے صرف ان صوبوں میں اکثریت حاصل ہوئی جہاں کی آبادی میں ہندوؤں کی عظیم اکثریت تھی۔ اس انتخابی جیت سے وزارتوں کی وہ کرسیاں کانگریسیوں کی دسترس میں آگئیں جن سے ان کی گزرتاریوں کے احکامات صادر ہو کرتے تھے وہ بالآخر ان کرسیوں پر ٹھکن بھی ہو گئے۔ اس ٹھکن اور قوت نے انھیں بدست کر دیا۔ چنانچہ کانگریس ایک عوامی جماعت کی بجائے فسطائی جماعت بن گئی اور اپنے استیلاء و آمریت کی تشکیل و تعمیر میں منہمک ہو گئی۔

اس ہوس استیلاء نے سیاسیات میں چند رجحانات جنہیں پیدا کر دیں۔ ان رجحانوں کو گزشتہ جنگ عالمگیر نے اور ابھارا دیا۔ چنانچہ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ہندی کتاب سیاسیات کا آئینی باب ہندوؤں کی طرف سے باطل دعویوں اور لاطائل دلیلوں سے سیاہ ہے۔ وہ اس دوران میں گولڈسمتھ کے پیل کی طرح ایک ہی چکر میں گھومتے رہے۔ جنگ چھ سال تک جاری رہ کر ممالک و اقوام عالم کی بنیادیں زیر و زبر کر کے ختم بھی ہو گئی مگر دنیائے ہند جہاں تھی وہیں کی وہیں رہی۔

صوبائی وزارتوں پر فائز ہو کر کانگریس سرپرست جاری تھی کہ انہیں جنگ نے آیا۔ برطانیہ نے سب سے پہلے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا اور جنگ کی طرح ڈالی۔ ہندوستان اس کا محکوم تھا وہ خود بخود متحارب ہو گیا۔ جنگ کے پہلے موسم بارہا نے عجیب و غریب گل کھلائے۔ یورپی ممالک فرانس سمیت روند ڈالے گئے اور ہٹلر کے الفاظ میں جنگ یورپ ختم ہو گئی۔ برطانیہ جنگ یورپ کے جنم سے براستہ ڈنکرک بچ کر نکلا۔ وہ نکل اور بیچ تو سکا مگر اس کی بین الاقوامی حیثیت بالکل مخدوش ہو گئی۔ اس کے قدم اس انداز سے اکھڑے تھے کہ سیاستین نے سلطنتِ برطانیہ کے زوال و خاتمہ سے متعلق سنجیدگی سے گفتگو کرنی شروع کر دی تھی۔

کانگریس برطانیہ کی اس مخدوش حالت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اس نے اندازہ کر لیا کہ سودا بازی کا مناسب وقت آ گیا ہے اور چونکہ وہ پیشتر ہندوستانی صوبوں کی وزارتوں پر قابض ہے اس لئے لامحالہ وہی انگریزی کی جانشین بننے کی حقدار ہے۔ اس انداز سے اس کے قلب و نگاہ میں بنیادی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ کانگریس اور گاندھی جو اس سے پہلے ہندو مسلم مفاہمت کو آزادی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے (یا کم از کم کہا ضرور کرتے تھے) یہ اعلان کرنے لگ گئے کہ ہندو مسلم مسئلہ انگریز کا پیدا کردہ ہے اور بہ نوع ایک خانگی مسئلہ ہے جو آزادی ملنے پر خود بخود حل ہو جائے گا۔ چنانچہ کانگریس کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا کہ مرکز میں فی الفور ایک قومی حکومت کی تشکیل کی جائے جو مرکزی مجلسِ مقننہ کے سامنے جواب دہ ہو۔ اور صوبوں کی نایندہ حکومتوں کا تعاون حاصل کر سکے۔ یہ مطالبہ جولائی ۱۹۴۷ء میں پیش ہوا جبکہ انگریز یورپ سے پسپا ہو چکا تھا اور وہ یہاں تک سوچ رہا تھا کہ وہ اپنی حکومت کا مرکز لندن سے کسی اور جگہ منتقل کر لے

اور اٹھکستان کی بجائے اپنی نوآبادیات میں سے کسی ایک کو محاذِ جنگ بنائے اور وہاں سے دشمن کا مقابلہ کرے۔
 دسمبر ۱۹۴۷ء میں جب جاپان نے مشرقِ بعید میں اتحادیوں پر حملہ کر دیا اور برق رفتاری جٹلموٹر کاکہل
 سے پھلانگتا ہوا پر بھی قابض ہو گیا تو جنگی نقطہ نگاہ سے ہندوستان اتحادیوں کے لئے ایک اہم
 حیثیت کا مالک بن گیا۔ کیونکہ یہی ملک ایک ایسا مستقر بن سکتا تھا جہاں سے جاپان پر دفاعی اور جہازنی حملے
 کئے جاسکتے تھے۔ ہندوستان کو جنگی تیاریوں کا مرکز بنانے کے لئے انگریز ضروری سمجھتا تھا کہ اہالیانِ ہند کی
 ایک حد تک تالیفِ قلوب کرے اور ان کی سیاسی جماعتوں کا تعاون حاصل کر لے تاکہ وہ اندرونی خلفشار
 سے مطمئن ہو جائے اور کیسوی سے جنگ لڑ سکے۔ اسی لئے برطانیہ نے ایک ایسی پیش کش کی جو پہلے کی
 پیش کشوں سے زیادہ دودس تھی۔ اس پیش کش کے حسنِ وقع پر بحث کے بغیر یہ کہنا پڑتا ہے کہ برطانیہ
 نے پہلی مرتبہ ہندوستان کا تعاون اس اہل پر حاصل کرنے کی کوشش کی کہ اسے بھی حقیقی سیاسی
 اختیارات میں شریک کیا جائے۔

انتخابات عامہ میں کانگریس کا کوئی قابلِ ذکر حریف نہیں تھا لیکن حالاتِ نابعدِ انتخابات نے
 کانگریس کے لئے چند در چند مشکلات پیدا کر دیں۔ اس کا خطرناک حریف مسلم لیگ کی صورت میں نمودار ہوا
 جس نے بقول قائدِ اعظم محمد علی جناح کانگریس کی نشہ اقتدار کی بدستوبوں سے متنبہ ہو کر یہ اعلان کیا کہ
 بساطِ ہند پر ایک تیسری طاقت بھی ہے اور وہ مسلمان کی ہے۔ ان دو سیاسی جماعتوں میں باہمی خلیج
 وسیع ہوتی گئی جس سے مسلم لیگ مسلمانوں کو مجتمع کرنے میں اور ٹھہک ہو گئی۔ بالآخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آل انڈیا
 نیشنل کانگریس عملاً ایک ہندو جماعت بن کے رہ گئی۔

کانگریس کی آمریت کے مقابل میں مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ مستقلاً تقسیم ہند چاہتی ہے لیکن
 جنگ کے دوران میں مرکزی حکومت میں مساوی نیابت اور مذمہ داری کو قبول کرے گی بشرطیکہ کوئی ایسا اقدام
 نہ کیا جائے جو بعد از جنگ تدرینِ آئین اور تشکیلِ پاکستان پر اثر انداز ہو۔ ایک طرف کانگریس کی ہوسِ آمریت
 اور دوسری طرف مسلم لیگ کی خواہشِ مشارکت و متضاد مطالبے تھے۔ کانگریس افہام و تفہیم کی بجائے
 رفقائے کار کو خود سری سے تھکر کر چلے اقتدار حکومت پوری طرح سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ مسلم لیگ دلائل و

شواہد سے اپنا حق زلیست منوانا چاہتی تھی۔ ان متضاد ادعیات و مطالبات نے بھران پیدا کر دیا۔ جنگ ایسے نازک دور میں داخل ہو چکی تھی کہ انگریز کسی ایک فریق کو نافوش کر کے اس کا تعاون ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ گیارہ ہندی صوبوں میں سے آٹھ کانگریس کے زیر حکومت تھے لیکن مسلمان مسلم لیگ کے مرکز پر جمع ہو کر ہندی سیاست میں ایسی حیثیت اختیار کر چکے تھے کہ انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ فوجی اعتبار سے وہ شمشیر زن بازو تھے۔ اس حقیقت کا انکار و بطلان ناممکن تھا۔

اندرون ہند یہ حالت تھی اور بیرون ہند جنگ کے پکتے شعلے سرحدوں کو ہضم کرتے نظر آ رہے تھے انگریز انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہندوستان کو مضبوط فوجی مرکز بنانے اور اہالیان ہند کا تعاون حاصل کرنے کے لئے جنگی کابینہ کے رکن سسرٹیفورڈ کرسپل کلاہین ہدایات دے کر بھیجا کہ وہ سیاسی جماعتوں اور ان کے قائدین سے گفت و شنید کریں اور انھیں ان تجاویز پر متفق کرائیں۔ کرسپل ۲۳ مارچ ۱۹۴۷ء بمبئی کے یوم پاکستان کو دہلی پہنچے۔ رہنماؤں سے ضروری بلا قاتوں کے بعد بالآخر انھوں نے تجاویز کو شائع کر دیا۔

۱۹۴۷ء کی برطانوی پیش کش میں اختتام جنگ کے بعد ہندوستان کو نوآبادیاتی درجہ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن اس نئی پیش کش میں برطانیہ اس اقدام کے لئے تیار ہو گیا کہ ہندوستان کو ایسی ششمرہ بنانے کا اقدام کیا جائے جو اگر چاہے تو دولت مشترکہ برطانیہ سے علیحدہ بھی ہو سکے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ اختتام جنگ کے بعد ایک مجلس دستور ساز قائم کی جائے گی۔ اس مجلس کا طریق انتخاب جلد اہم فرقوں کے مابین متفقہ فیصلہ نہ ہونے کی صورت میں اعلیٰ قدرتا سب نمائندگی کے اصول پر ہوگا اور اسے ان صوبائی مجالس مقننہ کے ایوان ہائے زیریں منتخب کریں گے۔ جن کے اس وقت تک انتخابات تو ہو چکے ہوں گے۔ ہندوستانی ریاستوں کو اپنے نمائندے بھیجنے کی دعوت دی جائے گی اور ان کی نیابت ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق ہوگی۔

حکومت برطانیہ اس طرح کے مسودہ قانون کو دو شرائط پر منظور کر کے نافذ العمل کرنے پر آمادگی کا اظہار کرتی تھی۔ پہلی شرط یہ کہ اگر کوئی صوبہ یا صوبے اس آئین کو تسلیم نہ کریں تو وہ براہ راست برطانیہ سے

تعلق استوار کرنے اور اسی طریق سے اپنا علیحدہ آئین مرتب کرنے کے متحق ہوں گے۔ ان کا درجہ ہندی یونین کے برابر ہوگا۔ ہندی ریاستیں علیٰ ہذا القیاس نئے آئین کو قبول یا مسترد کرنے کی مختار ہوں گی۔ ہر دو حالتوں میں ان کے معاہداتی امور و انتظامات کو گفت و شنید باہمی سے طے کیا جائے گا۔

دوسری شرط یہ کہ برطانیہ اور مجلس دستور ساز میں ایک معاہدہ طے ہوگا جو ان تمام امور پر حاوی ہوگا۔ جو انتقال اقتدار کا لازمی نتیجہ ہوں گے۔ ان میں خصوصیت سے وہ امور شامل ہوں گے جو حکومت برطانیہ کی ان سابقہ ذمہ داریوں سے متعلق تھے جو ہسلی یا مذہبی اقلیتوں کی حفاظت کے سلسلہ میں اس پر عائد ہوتی تھیں۔ پھر یہ کہ برطانیہ تدوین آئین نو تک، دفاع بند کو اپنی عالمگیر جنگی مساعی کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے اپنے قبضہ میں رکھے گا۔ لیکن ہندوستان کے عسکری، اخلاقی اور مالی ذرائع کی تنظیم کی ذمہ داری حکومت ہند پر ہوگی جسے وہ اہالیان ہند کے تعاون سے نبھانیگی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے حکومت برطانیہ نے خواہش کی، بلکہ اس کی دعوت دی کہ اہم ہندی فرقوں کے زعماء، فی الفور اور موثر انداز سے ملک کے، بلکہ دولت مشترکہ اور اقوام متحدہ کے مشوروں میں شریک ہوں۔

ان تجاویز میں برطانیہ نے پہلی مرتبہ اعلانیہ طور پر اپنی حکومت کے کسی جز کو یہ اختیار دیا کہ وہ دولت مشترکہ سے باہر بھی جاسکتا ہے۔ جنگ کے دوران میں جزوی افریقہ اور آئرلینڈ کے رویہ سے ہر چند یہ ثابت ہو گیا تھا کہ اجزائے دولت مشترکہ حق علیحدگی رکھتے ہیں لیکن برطانیہ نے اس کا اعتراف پہلی مرتبہ کیا۔ یقیناً ہندوستان اس سے زیادہ کچھ نہیں مانگ سکتا تھا۔ اب نہ محض اس کا سیاسی درجہ پہلے کی نسبت بلند ہوا تھا بلکہ اسے اس شاہراہ پر ڈالا جا رہا تھا جس پر گم زن ہو کر وہ ہر قسم کی غیر ملکی غلامی سے آزاد ہو سکتا تھا۔ کسٹرفورڈ رپورٹ نے ایک اجاری ملاقات میں اس حق کو بالکل بغیر مہم اور واضح کر دیا۔ انہوں نے صاف صاف بتا دیا کہ ہندوستان دولت مشترکہ سے نکل کر دینلے کسی ملک سے ہی اتحاد پیدا کر سکتا ہے اور چاہے تو دیگر غیر مالک میں شامل بھی ہو سکتا ہے۔

تدوین آئین کے معاملہ میں ہندوستان کو کئی اختیارات دیدیئے گئے۔ کیونکہ یہ کام کلید ہندوستان کے سپرد کر دیا گیا اور ہر قسم کے خارجی اثر کو یک قلم ختم کر دیا گیا۔ ہندوستان کا یہ حق بھی پہلی مرتبہ تسلیم ہوا

درناب تک حکمت عملی رہی تھی کہ آئین ہند کی تدوین کی ذمہ داری ہندوستان پر نہیں بلکہ برطانوی پارلیمنٹ پر ہے۔ برطانیہ نے مجلس دستور ساز سے معاہدہ کرنے پر اظہارِ رضامندی کر کے اس مجلس کو آزاد مجلس تسلیم کر لیا۔ برطانوی افواج کے متعلق بھی سرگرس نے وضاحت کر دی کہ وہ واپس بلائی جائیں گی اور ہندوستان میں صرف وہی غیر ملکی افواج رہ سکیں گی جن کی اجازت ہندی یونین یا یونینیں دیں گی۔

ہندوستان کے آئین نو کے سلسلے میں یہ ذکر کر دینا مناسب ہو گا کہ انگریز کے علاوہ جو آئین و اقتدار کا مالک تھا اور اب ان سے دستکش ہو رہا تھا، تین نمایاں فریق میدان میں تھے جن کا اثر ناقابلِ رد اور حیثیت ناقابلِ انکار تھی۔ ایک طرف کانگریس تھی جو عنانِ حکومت مکمل طور پر اپنے قبضہ میں لے کر کانگریس راج کے ماتحت باقی فریقوں کو بے چارہ بنا دینا چاہتی تھی۔ دوسری طرف مسلم لیگ تھی جو دس کروڑ مسلمان ہند کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ وہ کانگریس کی فطائیانہ آمریت کو ٹھکر کر آسمان ہند کے نیچے بے خانماں مسلمان کے لئے ایک ملی نشین کا مطالبہ کر رہی تھی۔ یہ دونوں سیاسی جماعتیں اپنے اپنے داعیات پر قائم اور مطالبات پر مصر تھیں۔ تیسرا فریق والیان ریاست کا تھا جن کا پیش نہاد بقائے اقتدار ذات کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کے سامنے نہ سیاسی تقاضے تھے، نہ ملکی مفادات۔ وہ اب تک انگریز کے سہارے جی رہے تھے بلکہ ان کی سرکاری انگریزی عملداری کی مصلحتوں کی رہن منت تھی۔ انگریزی اقتدار کے خاتمہ میں وہ اپنی شخصی حکومت کا خاتمہ دیکھ رہے تھے۔ وہ سیاسی گفتگو ہائے مصالحت میں سیاسی جماعتوں کے دوش بدوش شریک نہیں تھے لیکن ان کی ہستی ایسی گفتگوؤں کی ناکامی کی بلا واسطہ ذمہ دار ضرورتی۔

سرگرس مٹن چونکہ جنگی ضروریات کے تحت آیا تھا اس لئے اس کے پیش نظر معاملہ کے دو پہلو تھے ایک ہنگامی اور فوری ضرورت تھی۔ اشد ضرورت تھی کہ ہندوستان کی بے پناہ جنگی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر دشمن کا جواب دیا جائے۔ اس کا حق خدمت "مض ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ مستقبل کی آئین سازی مکمل طور پر ہندوستان کے سپرد کر دی جائے۔ اس کے لئے فوری اقدامات کی ضرورت تھی۔ ہندوستان کے باہمی منافقات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انگریز کی ساری صفات اور خدات کے

بادجو اس کے دو صد سالہ تعلق نے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان بد اعتمادی کی گہری طبع حاصل کر دی تھی۔ اس باہمی بد اعتمادی کا نتیجہ تھا کہ انگریز نے جب بھی اصلاحات کی نئی قسط ہندوستان کو دی اُسے ہندوستان نے مشتبہ نظروں سے ہی دیکھا اور اسے ایک سیاسی چال سمجھا۔ یہ بد اعتمادی ۱۹۴۷ء میں بدستور موجود تھی۔ چنانچہ کانگریس نے اس پیش کش کو انگریز کی بین الاقوامی کمزوری پر معمول کیا اور اس کے قول پر اعتبار کرنے کی بجائے اس سے تحریری اور قانونی ضمانت طلب کرنی چاہی۔ مثلاً ہنگامی ضروریات کے تحت مرکز میں نئی مجلس منتظمہ کی تشکیل لازمی تھی۔ یہ مجلس کانگریس، مسلم لیگ اور دیگر اقلیتوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی۔ ان کے علاوہ انگریز وائسرائے اور انگریز کمانڈر انچیف بھی اس میں موجود ہوتے اور وائسرائے کی حیثیت ایک رکن کی نہ ہوتی بلکہ اسے اختیار ہوتا کہ وہ چاہے تو مجلس کے فیصلوں کے خلاف بھی فیصلہ دے سکے۔

ہر چند کہ اس نے یہ وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ عملاً مجلس منتظمہ کی حیثیت ایسی نہیں ہوگی کہ وائسرائے ایک جاہل بادشاہ کی طرح اسے نظر انداز کر دے بلکہ وہ اس قسم کی شالیں قائم کر سکتی ہے کہ بغیر قانون ہند بدلے وہ اپنے اختیار میں توسیع اور مرتبہ میں بندی پیدا کرے۔ لیکن نظام جمہوریت کے عملی تجربے نقدان اور ہوس امریت نے کانگریس کو یہ لفظی وعدے قبول نہ کرنے دیئے۔ وہ قانونی اعتبار سے اپنی حیثیت مستحکم اور ناقابل شکست بنا چاہتی تھی اور یہ دوران جنگ میں امر محال تھا۔ انگریز اس انقلاب کے لئے تیار نہ تھے کیونکہ اولیں مسئلہ کامیابی سے جنگ لڑنا تھا۔ ایسے میں ہندوستان کے بیچ و بیچ آئین کی تدوین میں منہمک ہو جانے سے جنگی مساعی کو ناقابل تلافی صدمہ پہنچنا یعنی تھا۔ جنگ انگریز کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھی وہ قدرتی طور پر ادھر سے توجہ نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اسی لئے وہ ہر اس مسئلہ کو بعد از جنگ تک ملتوی کر رہا تھا جسے اس وقت ٹالا جا سکتا تھا اور بعد میں حل کیا جا سکتا تھا۔ کانگریس معاملہ کی نزاکت کا کماحقہ احساس رکھتے ہوئے اس ضد پر قائم رہی کہ اگر ان کا مطالبہ آئین کی تبدیلی سے تسلیم ہو سکتا ہے تو آئین کو فوراً اور ضرور تبدیل کر دیا جائے۔

کانگریس ہندوستان کی جنگی مساعی کو عالمگیر جنگی مساعی کا حصہ تسلیم کرنے ہوئے یہ تو مان گئی کہ

مسلم لیگ اسے بغیر تحفظات کے قبول نہیں کر سکتی تھی۔ تحفظات اس قسم کے ہو سکتے تھے کہ "فرقہ وارانہ معاملات میں اسی فرقہ کے ارکان کی رائے کو تسلیم کیا جائے جو ان سے براہ راست متعلق ہوں لیکن ایسے میں فرقہ وارانہ معاملات کی تعریف بجائے خود ایک استخوان نزع بن جاتی۔ مسلم لیگ کا دعویٰ تھا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ لہذا اس کے نزدیک اکثر مسائل "فرقہ وارانہ" تھے۔ لیکن کانگریس صرف انہی مسائل کو فرقہ وارانہ تسلیم کرتی تھی جو مذہب کی چند رسوم ظاہری سے متعلق تھے۔ مثلاً عبادت وغیرہ۔ ان بنیادی اختلافات کے ہوتے ہوئے کانگریس اور مسلم لیگ کا مساوی اشتراک تو قابل فہم تھا لیکن اقلیت اور اکثریت کا تعلق ناقابل عمل تھا۔ اس دشواری کا کرس کی ناکامی میں نمایاں حصہ تھا۔

مقامی طور پر ہندی جماعتوں نے اس وقت کا حل تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ مشرا میری وزیر ہند کو بہ طعنہ دینا پڑا کہ "قائدین ہند سے ملاقات کرنے کے لئے کرس تو ہندوؤں میں اڑ کر گیا لیکن خود قائدین ایک دوسرے سے ملنے کے لئے چند قدم بھی نہیں بڑھے" اگر وہ سنجیدگی اور دیانتداری سے گفت و شنید کرتے تو تصفیہ کی توقع کی جاسکتی تھی لیکن یہاں یہ مصاحبت خواہی کیسر مفقود تھی۔

جنگ کی فوری ضروریات کے علاوہ کرس کی پیشکش مستقبل کے آئین سے متعلق تھی۔ اس لئے تجویز یہ تھی کہ اختتام جنگ پر ایک مجلس دستور ساز کا انتخاب کیا جائے۔ یہ انتخاب صوبائی ایوان ہائے زیریں سے تناسب نیابت کی بنا پر ہونا قرار دیا گیا۔ صوبائی ایوانوں میں سے چار ایوانوں یعنی بنگال، پنجاب سندھ اور سرحد کو چھوڑ کر باقی سات ایوانوں میں ہندوؤں کی غالب اکثریت تھی کیونکہ ان صوبوں میں مسلمانوں کا تناسب آبادی بہت کم تھا۔ باقی چار صوبوں میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے مقابلہ میں کم تھی۔ پنجاب اور بنگال میں خالص مسلم نشستیں نصف سے بھی کم تھیں۔ گویا ان دو صوبوں میں مسلمان اکثریت آبادی کے مالک ہوتے ہوئے بھی مجلس مقننہ میں اقلیت میں تھے۔ سندھ اور سرحد میں ان کا تناسب نصف سے زائد ضرور تھا لیکن ان کے جائز حق سے کافی کم تھا۔ ان صوبوں کی اقلیتیں یوں بھی کافی موثر تھیں لیکن ان کو ناجائز پاسنگ دے کر اکثریت کو اقلیت میں بدل دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجلس

دستور ساز جو ان مجالس کی طرف سے منتخب ہوگی اور جس کی تعداد و ارکان ان مجالس کے مجموعی ارکان کا
سواں حصہ ہوگی اس میں غالب اکثریت ہندو کی ہوگی۔ اس میں بھی لامحالہ مسلمانوں کا تناسب ان کی
آبادی کے مقابلہ میں کم ہوگا۔

پھر اس مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے طے ہوں گے جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان ہر معاملہ
میں شکست کھا جائیں گے اور وہ اس اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گے جس کی اقلیت کئی ناقابل تردید تھی
یہ پوزیشن مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ تھی کیونکہ ان کا تحفظ جداگانہ انتخابات میں تھا جسے سرے سے
تسلیم ہی نہیں کیا گیا تھا۔ حالانکہ مجالس مقننہ اور دیگر انتخابی اداروں میں انھیں جداگانہ انتخاب کی رعایت حاصل
تھی۔ مجوزہ مجلس دستور سازی کی ترکیب میں یہ رعایت بھی ان سے چھین لی گئی تھی۔

مسلم لیگ اسی پر معترض تھی کہ کانگریس ایک قدم اور آگے بڑھی۔ اس نے ریاستوں کی نشستوں
پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہا اور اس خیال سے کہ شاید والیان ریاست از خود اس کے چشم و ابروہ پر قص کریں
اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ ریاستوں کی طرف سے جو نمائندے آئیں وہ والیان ریاست کی طرف سے
نمزد نہ ہوں بلکہ عوام کے نمائندے ہوں۔ یہ مطالبہ جمہوری تقاضوں کی تکمیل کی تنائے بنیاب کا منظر تھا
بلکہ کانگریس کی ہوس آمریت کا آئینہ دار تھا۔ وہ اس مجلس میں زیادہ سے زیادہ جمعی ضروری جمع کرنا چاہتی تھی
اور چونکہ ریاستی باشندے بیشتر ہندو تھے اس لئے اس نے یہ مطالبہ کیا تاکہ وہی نمائندے آسکیں جو ہندو
ہونے کے علاوہ کانگریس سے تعلق رکھتے ہوں اور اس طرح ان کی ووٹوں میں اضافہ کا باعث ہوں۔ یہ
طرز انتخاب اور ترکیب مجلس مسلم لیگ کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ مسلمانوں کی قسمت دست غیر
میں دینے پر آمادہ نہ تھی۔ یہی اس کا موقف تھا۔ لیکن کانگریس مسلمان کی شاہرگ میں خونیں پنجے گاڑ دینا چاہتی
تھی نتیجہ سوائے تسطل کے اور کیا ہو سکتا تھا۔

کانگریس کا شدید اعتراض صوبوں کے حق علیحدگی پر تھا۔ صوبوں کو یہ حق دے کر برطانیہ نے مسلم لیگ
کی اشک شونی کی تھی۔ کانگریس اسی کناہے وایا پر آپے سے باہر ہو گئی۔ درآئیکہ یہ نام نہاد حق مسلم لیگ کو نزدیک
قابل استدعا تھا۔ کیونکہ ساری پیش کش کا خمیر اس نظر سے اٹھا لیا گیا تھا کہ ہندوستان ایک ملک ہے

اور ہندوستان کے مختلف النوع، مختلف العقیدہ اور مختلف المخیال باشندے ایک قوم اس منبع سے پھوٹنے والے چٹے شفاف اور پاکیزہ نہیں ہو سکتے تھے۔ کانگریس کو بھی گوارا نہ ہوا کہ اس منبع سے یہ مکدر چشمہ پھوٹے اور مسلم لیگ نے اس لئے اسے ٹھکرا لیا کہ اس کا پانی منظر اور مصفاہ نہ تھا۔

علیحدگی کا مطالبہ مسلمان قوم کر رہی تھی لیکن یہ حق مسلمان کو نہیں بلکہ صوبوں کو دیا گیا اور ہر جذبہ عقلی طور پر صوبوں کو علیحدگی کا حق دیا گیا لیکن عملاً اسے ناممکن الحصول بنا دیا گیا۔ اس کے لئے جو لائحہ بیان کیا گیا وہ یہ تھا کہ صوبے کی مجلس اس سوال کا فیصلہ کرے گی کہ آیا اسے مجوزہ ہندوستانی یونین میں شامل ہونا چاہئے؟ اگر اہماتق کے حق میں ساٹھ فیصدی سے کم اکثریت ہو تو اقلیت کو حق ہوگا کہ وہ بالغ رائے دہندگی پر تمام سرحدوں سے استصواب کا مطالبہ کرے۔ یہ رعایت مسلمانوں کو دی گئی تھی لیکن اسے اس شرط سے مشروط کر کے ناکارہ بنا دیا گیا۔ مسلمان اکثریت کے دو صوبوں میں ساٹھ سے کم اکثریت کی آبادی کے مالک تھے اور ہر صوبے کی مجلس مقننہ میں ان کی نیابت ایسی رکھی گئی تھی کہ وہ ایوان میں اقلیت بن جاتے تھے۔ ان حالات میں اس رعایت کا انصیب کچھ فائدہ نہ تھا۔ بنا بریں ان کا یہ مطالبہ حق بجانب تھا کہ اگر تقسیم کا اصول تسلیم کرنا ہے تو اسے جملہ نتائج و عواقب کے ساتھ دیا اندازی سے تسلیم کیا جائے ورنہ اس مذاق کو روا نہ رکھا جائے۔

اس گفتگوئے آئین میں متعلقہ فریق ایک دوسرے کو شکوک سے دیکھتے تھے اور انہوں نے اسی شک کی منفی اساس پر گفتگو میں کیں اور قلب و نگاہ کو مستبد کام جوٹیوں سے پاک نہ کر سکے۔ ایسی فضا میں پیشکش کا مقبول ہو کر نافذ العمل ہونا از قبیل محالات تھا۔ اس مفاہمت ناپسندی کو برطانیہ کی اس شرط نے اور تعویث دی کہ یہ پیش کش یا تو کالاً تسلیم کی جائے یا کالاً مسترد۔ یعنی انگریزی طرف سے باہمی گفت و شنید کے نتیجے کے طور میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی اور انہوں نے اپنے نائیدے کی سعی محنت کو محدود و پابند کر دیا۔ اس شرط کی عدم موجودگی سے مفاہمت کے امکانات شاید زیادہ روشن نہ ہوتے لیکن ناکامی کی ایک وجہ ضرور کم ہو جاتی۔ چنانچہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے اس تحدید کے پیش نظر پیشکش کے فوری پہلو سے بحث کرنا غیر ضروری سمجھا کیونکہ مستقل حل ان کے نزدیک قابلِ رد تھا اور اس کے

استراوا کے بعد پیشکش کی دوسری شق سے بحث عبث تھی۔

کرپس کی گفتگوؤں کے دوران میں ہندو میسجیاس اور تشویش و انتظار کے عالم میں تھا۔ اس مشن کی ناکامی سے دل برداشتگی اور یاموسی کی عام ہردوڑگئی اور سیاسی اور آئینی تعطل پہلے سے زیادہ لاینحل نظر آنے لگا۔

اگر قائدین ہند اس نحل کو دور کرنے کے لئے تیار نہیں تھے تو عالمگیر قوتیں ساکت و خاموش نہیں بیٹھی تھیں۔ مشرق سے جاپان کا خطرہ دن بدن حتمی ہوتا جا رہا تھا۔ برا اور جزائر انڈمان کے سقوط کے بعد ہندوستان کے بعض ساحلی شہروں پر جاپانی طیاروں نے بمباری شروع کر دی تھی۔ اس کی گذشتہ فتوحات کے پیش نظر ہندوستان پر باقاعدہ حملہ بعید از قیاس نظر نہیں آتا تھا۔ شمال مغرب سے جرمن سیلاب فتوحات کے پیش رو رہے سرحدوں سے نکلنے محسوس ہوتے تھے۔ ہلر ایک طرف باسکو تک پہنچ چکا تھا اور دوسری طرف کایشیا کے پہاڑوں سے ہوتا ہوا ایران تک آچکا تھا۔ خوف و ہراس کے عالم میں جرمنی اور جاپانی فوجیں دہلی میں ملتی نظر آتی تھیں۔ اس طوفانِ بلا میں کانگریس کے لئے زریں موقع تھا۔ اصولوں نے اس جن اتفاق پر اعتماد کیا جس سے گاہ طوفان بھی کارناخذائی کرتا ہے اور طغیان موج آبِ بیڑے کو اچھال کر ساحل پر ڈال دیتا ہے۔ ایک طرف ہلر تھا۔ آریائی تہذیب کا نقیب، اور دوسری طرف جاپان۔ ہندی آغوش سے ابھرے، گونکالے ہوئے بدھ مت کا پروردہ جاپان۔ وہ بھی ہندو کا دھرمی بھائی۔ بعض ہندو کچھ عرصہ سے جاپان سے تعلقات استوار کر کے پان ہندو تحریک کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اب وہ خواب مشکل ہوتا نظر آتا تھا۔ ایک طرف آریائی تہذیب کا نقیب، دوسری طرف بدھ مت کا پیرو، دونوں کو خوش آمدید کہا جائے لگا اور استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

کرپس کی آمد کو کانگریس نے برطانیہ کی کمزوری سمجھا تھا مگر جب ان کی آمریت تسلیم نہ ہوئی اور برطانیہ ان کی توقعات کے مطابق سپر انڈیا نہ ہوا تو کانگریس نے رسوائے عالم ہند چھوڑ دو، نعرہ ایجاد کیا اور برطانیہ کو بناوٹ کا رعب دے کر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا۔ ۸ اگست کو کانگریس کمیٹی نے مجلسِ عاملہ کی سفارش پر ہند چھوڑ دو کی تجویز منظور کی جس میں مندرجہ ذیل مطالبات پیش کئے گئے تھے۔

۱۔ حکومت برطانیہ ہند سے دستبردار ہو جائے۔

۲۔ آزادی ہند کا اعلان ہوتے ہی ایک عارضی حکومت مرتب کی جائے جو قابل ذکر ہندی عناصر پر مشتمل ہو۔

۳۔ وہ عارضی حکومت مجلس دستور ساز کے قیام کی صورت پیدا کرے تاکہ ایک متفقہ آئین تیار کیا جاسکے جو وفاقی ہو اور صوبیات کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دے۔

اس مطالبہ کی عدم منظوری کی صورت میں گاندھی ہندوستان کو خدایا بدمعنی کے حوالے کر دینے پر مستعد و مکرستہ ہو گئے۔ کانگریس کی "عمومی بغاوت" نے راہنمایان کانگریس اور دیگر بیشتر کارکنوں کو جیل میں پہنچا دیا۔ عدم تشدد کا نام ہندوستان کی لگیوں اور بازاروں میں روسوا ہوا۔ دوروزہ شورا شوری کے بعد ہنگامہ فرو ہو گیا اور محفل سونی نظر آنے لگی۔

کانگریس کی عدم موجودگی میں انگریز حکومت کا کاروبار تنہا مسلم لیگ کے سپرد نہیں کرنا چاہتا تھا، حالانکہ مسلم لیگ اس کی مجبوریوں کے پیش نظر موجودہ آئین کی حدود میں رہ کر اختیارات کی طلب گار تھی۔ مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر کانگریس شریک حکومت نہ ہو تو لیگ ذمہ داری سے کاروبار حکومت چلانے پر تیار ہے اور اگر کانگریس آمادہ تعاون ہو تو وہ اس سے مساویانہ حیثیت سے شرکت کے لئے تیار ہے۔ انگریز اپنی مصلحت کے تحت ایسا نہیں کر رہا تھا۔ وہ غیر نایزہ اور غیر ذمہ دار افراد کو تو حکومت کا منصرم بنا سکتا تھا لیکن کانگریس کی عدم موجودگی میں مسلم لیگ جسی سیاسی جماعت کو اختیارات حکومت تفویض کرنے کے لئے رضامند نہ تھا۔ کانگریس پیچھے ہٹ کر اپنی بے راہ رویوں کا غیر جذباتی جائزہ لینے کے لئے تیار نہ تھی۔ لارڈ ویول ایسے فوجی دائرے کے آنے سے بنیم سیاست میں چہل پہل نظر آنے لگی۔ وہ ڈرامائی حیثیت سے لندن گئے اور وہاں ارباب حکومت سے مل کر ایک نئی تجویز تیار کر کے لائے۔ لارڈ ویول نے ملک معظم کی منظوری سے جون ۱۹۴۵ء میں اعلان کیا۔

میں مرکزی اور صوبائی سیاست کے راہنماؤں کو دعوت دے رہا ہوں کہ وہ مجھ سے مل کر مجلس منتقلہ کی ترتیب میں صلاح و مشورہ دیں۔ مجوزہ مجلس بڑے فرقوں کی نایزہ ہوگی اور موجودہ

آئین کی حدود کے اندر رہے گی۔ البتہ وہ ترکیبیں دائرے اور کمانڈر ناچیف کے علاوہ بالکل ہندی ہوگی۔ ملک معظم کی حکومت ایک قدم اور آگے جانا چاہتی ہے۔ اس کی تجویز ہے کہ وہ نوآبادیات کی طرح یہاں بھی ایک ہائی کمانڈر مقرر کرے جو برطانیہ کے تجارتی اور دیگر مفادات کی نگہداشت کرے۔

اس عارضی حکومت کی تشکیل کا مستقل آئینی تصفیہ پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ میں اور ملک معظم کی حکومت مستقل تصفیہ کی ضرورت سے غافل نہیں۔ ان تجاویز سے اس تصفیہ کو نسبتاً زیادہ سہل الحصول بنانا مقصود ہے۔

معرین ۲۵ جون کو ضلع میں جمع ہوں گے۔

اگر کانفرنس بے نتیجہ ثابت ہوئی تو موجودہ مجلس منظمہ جس نے نمایاں خدمات سر انجام دی ہیں بدستور موجود رہے گی تا آنکہ سیاسی جماعتیں کسی منفق علیہ فیصلہ پر پہنچ جائیں۔

دولتِ تجاویز عبوری دور سے متعلق تھیں۔ اس میں قائد اعظم، مشرک گاندھی اور صوبائی اسمبلیوں کے موجودہ اور سابق ذرائع اعظم وغیر سبھی شریک ہوئے۔

یہ کانفرنس سٹائلڈ کی کانفرنسوں سے مختلف فضا میں منعقد ہوئی۔ اب جرمنی شکست کھا چکا تھا اور جاپان کی شکست میں گنتی کے دن رہ گئے تھے۔ انگریزین الاقوامی سیاست میں اپنا کھویا ہوا وقار پھر حاصل کر چکا تھا۔ کانگریس کی امیدیں جو اس نے سٹائلڈ میں مشرق و مغرب سے وابستہ کر رکھی تھیں یورپ میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اس کے لاپتہ نام ویش تین سال جیلوں میں رہ کر سیاسی آوارگی سے اکتائے ہوئے تھے۔ جنگ کے نازک دور میں انھوں نے جس غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا اور جو خطرناک طریق کار اختیار کیا اس کی وجہ سے ہندی سیاست میں ان کا اپنا ڈنکرک بن رہا تھا۔ اب پھر سے گم شدہ متاعِ عزت کو تلاش کرنا تھا۔ لہذا جس برطانیہ کو اسٹائلڈ میں دکھائی جا رہی تھیں اور جس کے خلاف عمومی بغاوت کا اعلان کر دیا گیا تھا اب وقت تھا کہ اس کی خوشامد کی جائے کیونکہ وزارتوں کی کرسیوں پر متمکن ہو کر ہی ملک اور قوم کی نجات میں پھر سے مکر و محترم بنا جا سکتا تھا۔

شملہ کانفرنس میں مرکزی حکومت کی تشکیل سے متعلق تجویز ہوئی کہ اس میں سورن ہندوؤں اور مسلمانوں کی نیابت یکساں ہو۔ دیگر اقلیتیں علیحدہ طور پر شریک ہوں۔ اس تجویز اور جس انداز سے اس کی تفصیلات پر غور ہوا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت برطانیہ اور کانگریس نے حقائق کا کما حقہ احساس نہیں کیا تھا، یا وہ قصداً حقائق سے آنکھیں بند کئے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کی خوشنودی و تائید حاصل کرنے کے لئے یہ رعایت تو دے دی گئی کہ مسلمان اور سورن ہندو برابر کی تعداد میں ہوں گے۔ نیز اس کی تسلی اور دلجمعی کے لئے یہ اعلان کیا گیا کہ اس عارضی مفاہمت کا مستقل مفاہمت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا لیکن مساوات نیابت کو بے کار بنانے کے لئے یہ سچ لگا دی گئی کہ اچھوتوں، سکھوں اور عیسائیوں وغیرہ کا ایک ایک نمائندہ سورن ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ ہوگا۔ گویا یہ رعایت دے کر یہی کوشش کی گئی کہ حکومت میں مسلمانوں کا تناسب عملاً ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو۔ چنانچہ ۲۹ جون ۱۹۴۵ء کو شملہ میں اخباری نمائندوں کو بیان دیتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا۔

تجویز پول کی اساس ہندو مسلم مساوات پر ہے لیکن ہیں اس مساوات سے کوئی خوش یا غلط فہمی نہیں۔ کیونکہ مجوزہ مجلس منتظمہ میں مسلمانوں کا حصہ ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہوگا اور ماری مجلس میں مسلمان ایک تہائی کی اقلیت میں رہیں گے۔ ہندوؤں کی تعداد (بظاہر) مسلمانوں کے برابر ہوگی لیکن اچھوت اس پرستیزاں ہوں گے۔ نیز سکھوں کو بھی نمائندگی حاصل ہوگی اور ہم ابھی یہ نہیں جانتے کہ اور کون سا فرقہ یا فرقے حق نمائندگی حاصل کر لیں گے۔

اندریں حالات مجلس کی مخصوص ہیئت ترکیب کے پیش نظر اکثریت کانگریس کی ہوگی اور اس امر کی کوئی خاطر خواہ ضمانت نہیں ہے کہ کانگریس کثرت رائے سے مسلمانوں کے خلاف فیصلے صادر نہیں کریا کریگی۔

اسی دفاع میں کسی مفاہمت کی توقع بے کار ہوتی ہے چنانچہ کوشش بھی ناکام ہوئی۔ مسلمانوں کا زور توڑنے اور ان کی قوت رائے کو غیر واقع بنانے کے لئے کانگریس نے اپنے علاوہ دیگر غیر مسلم عناصر کی نمائندگی پر زور دیا۔ چنانچہ سکھوں، عیسائیوں اور اچھوتوں تک کے نمائندوں کی گنجائش پیدا کر لی گئی۔ اور اسی پر

اکتفا نہیں کی گئی بلکہ خود مسلمانوں کے حصہ پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی کوشش ہوئی اور کانگریس نے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کی پانچ نشستوں میں سے کم از کم دو کے لئے کانگریسی مسلمان نامزد ہوں۔ مسلمانوں کے حصہ پر ایک حملہ پنجاب سے کرایا گیا۔ سر خضر جیات پنجاب کے وزیرِ اعظم بطور وزیرِ اعظم شریک کانفرنس ہوئے تھے۔ لیکن لارڈ ڈویل اور گورنر گلگنیسی کی مصلحتوں نے ایک مسلمان نشست ان کے سپرد کر دی۔ یہ اقدام سراسر غیر آئینی تھا۔ خضر جیات نام نہاد یونینٹ پارٹی کے لیڈر تھے جو معجون مرکب تھی۔ وہ ایک سیاسی پارٹی کہلانے کی قطعاً مستحق نہ تھی۔ اگر بغرض استدلال اسے ایک سیاسی پارٹی تسلیم بھی کر لیا جاتا تو وہ پنجاب اسمبلی کے اندر اپنا وجود رکھتی تھی اور اس کے باہر صوبہ میں وہ ایک مردہ جماعت تھی۔ پھر خضر جیات کی شمولیت اس پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے نہ تھی اس پارٹی کو یہ حیثیت پارٹی دعوت ہی نہیں دی گئی تھی۔ خضر جیات بالکل اسی طرح کانفرنس میں شریک ہوئے تھے جس طرح دیگر صوبوں کے فدائے اعظم۔ لیکن تعجب ہے کہ کسی اور وزیرِ اعظم کو تو یہ حق نہیں دیا گیا لیکن پنجاب کے وزیرِ اعظم کو ایک نمائندہ اور وہ بھی مسلمانوں کے مقررہ حصہ میں سے دینے کا حق دیا گیا۔ اب سوائے اس کے کہ مسلمانوں کے خلاف متحدہ مواد کے نام سے موسم کیا جائے اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ ایسی فحشیاں مسلمانوں کا تعاون کیسے حاصل ہو سکتا تھا؟

یہاں ضمایہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جن آئینی مذاکرات کا ہم جائزہ لے رہے ہیں ان میں مسلمانوں کی ضد میں دیگر اقلیتوں کو غیر ضروری اہمیت دیدی گئی۔ کانگریس نے مسلمانوں کے مقابلہ میں سکھوں کو بڑھایا اور ان کے لئے ایک علیحدہ نشست حاصل کرنے کی سعی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نام نہاد دیگر اقلیتیں آئندہ مذاکرات میں متعلقہ فریق کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ ہر چند ان میں سے ابھی تک صرف سکھوں کی حیثیت باقاعدہ طور پر مسلم ہوئی ہے اور باقی اس درجہ تک نہیں پہنچ سکے۔ لیکن سکھوں کو یوں بانس پر چڑھانے سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں اور ابھی ہندوؤں کو اپنے طور پر نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ جس طرح آئینی مذاکرات میں سکھوں کو بڑھایا گیا بعد میں ہندوؤں نے سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا اور تقسیم کے بعد کے مسلمانوں کے قتل عام میں وہ ان کے آلہ کار بنے۔ وہ وقت بعد نہیں جبکہ ہندو اس خطرناک غلطی کو محسوس کر لیں گے جس کا ارتکاب انھوں نے محض مسلمانوں کی ضد

میں آکر کیا۔ شاید اس وقت اس کی تلافی ممکن نہ ہو۔

خیر یہ توجہ معترضہ تھا۔ اس تیززکاں رفتہ سے متعلق قیاس آرائیاں ہمارے حیطہ مضمون سے خارج ہیں۔ ہم ذکر کر رہے تھے کہ شملہ کانفرنس کی تعمیر میں ہی ایسی خرابی کی صورت مضمون تھی کہ وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ چنانچہ جب رائسہاؤں کی مشترکہ کانفرنس نے نتیجہ ثابت ہوئی اور وہ مجلس منظمہ کی تشکیل و ترکیب پر اتفاق نہ کر سکے تو لارڈ ڈویل نے کانگریس اور مسلم لیگ کو دعوت دی کہ وہ اپنے اپنے نامزدگان کی فہرستیں دیں تاکہ وائسرائے ازخود ان میں سے انتخاب کر لے۔ کانگریس نے جو فہرست داخل کی اس میں کانگریس کے علاوہ مسلم لیگی قارئین کے نام بھی موجود تھے۔ حالانکہ اس کا دائرہ انتخاب اپنی جماعت تک محدود تھا۔ اور مسلم لیگ نے مطلوبہ فہرست دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اسے محولہ بالا اعتراضات کے علاوہ ایک یہ اعتراض بھی تھا کہ ارکان مجلس منظمہ کے فرائض و تقسیم شعبہ جات سے متعلق کوئی اندازہ نہیں بتایا گیا تھا۔ وائسرائے اس ضمن کو آئندہ پرچھوڑنا چاہتے تھے۔ اور مسلم لیگ پہلے سے ضمانت لینا چاہتی تھی کہ مجلس میں اس کی موجودگی برائے نام نہیں ہوگی اور اس کے پاس بھی اہم شعبے ہوں گے۔ مسلم لیگ کے اس انکار کے بعد کانگریس نے موقع غنیمت سمجھا اور وائسرائے پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کے بغیر تنہا کانگریس کو اختیارات حکومت سونپ دینے: کانگریس البتہ مسلم لیگ کے لئے دروازہ کھلا رکھے گی اور وہ جب بھی چاہے۔ کانگریس کی عائد کردہ شرطوں پر؟ — شریک حکومت ہو سکیگی۔ گاندھی اور نہرو کی سرٹور کو ششوں کے باوجود انگریز نے اس سودا بازی سے اجتناب کیا۔

وائسرائے اور قارئین شملہ کی بلندیوں سے اتر کر پھر دہلی کے میدانوں میں آگئے۔ پھر وہی نعتل! مسلم لیگ پر عموماً مخالفین کی طرف سے یہ اعتراض ہوتا چلا آ رہا تھا کہ وہ مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت نہیں۔ جنگ کے دوران کی سیاست میں کانگریس اسی ضد پر اڑی رہی کہ وہی جملہ اقوام و اہالیان ہند کی خصوصی ترجمان ہے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے ایک حصے کی ترجمان ضرور ہے لیکن مسلمانوں کا قابلِ قدر طبقہ اور عوام کانگریس ہی کے موید ہیں۔ مسلم لیگ اس کے برعکس ہی متواتر اور ثابت کرتی رہی کہ سیاست ملی کا صحیح آئینہ مسلم لیگ کے علاوہ اور کوئی جماعت نہیں۔ کرپس کی آمد سے لے کر شملہ کانفرنس

کی ناکامی تک ہی مسئلہ لیگ اور کانگریس کے مابین بابہ النزاع رہا کہ مسلمان چھٹیت مجموعی کس جماعت کے ساتھ ہیں۔ مخالفین لیگ اپنے دعوے کے جواز میں یہ فرسودہ دلیل پیش کرتے تھے کہ ۱۹۳۶ء کے انتخابات عامہ میں کانگریس نے مجالس مفصلہ کی غالب نشستوں پر قبضہ حاصل کر لیا۔ درآنحالیکہ مسلم لیگ صرف گنتی کی نشستیں جیت سکی تھی۔ انتخابات کے نتائج واقعی سیاسی جماعتوں کی مقبولیت اور قوت کے مقیاس ہوتے ہیں مگر ۱۹۳۶ء کے جن انتخابات کا حوالہ دیا جا رہا تھا ان کے نتائج کو بدلتے ہوئے حالات نے اس قدر فرسودہ قرار دیدیا تھا کہ وہ صحیح رائے کی اساس نہیں بن سکتے تھے۔ مخالفین لیگ نہایت ڈھٹائی سے ان باطل اعداد و شمار کو دنیا کے سامنے اصرار و تکرار سے پیش کر کے دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونک رہے تھے ۱۹۳۵ء کے قانون ہند کے ماتحت جو اولین انتخابات عامہ برپا ہوئے ان میں مسلم لیگ تنظیمی اور پروپیگنڈائی نقطہ نگاہ سے عہد طفولیت میں تھی۔ لیکن انتخابات کے بعد اس نے مسلمانوں کو اس قدر مضبوطی سے اپنے آپ سے وابستہ کر لیا کہ بعد کے ضمنی انتخابات میں اس نے قریباً فیصدی کامیابی حاصل کی۔ یہ ضمنی انتخابات بعض ایسے مسلم حلقوں میں منعقد ہوئے جہاں کانگریس کی طاقت ناقابل شکست سمجھی جاتی تھی۔ اس کے باوجود مسلم لیگ نے کانگریس کو شکست فاش دی، چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ کوئی ساٹھ کے قریب ضمنی انتخابات میں سے کانگریس صرف دو تین جگہ مسلم لیگ کو شکست دے سکی۔ یہ ایسی تبدیلی تھی جس نے ۱۹۳۷ء کے انتخابی نتائج کو باطل کر دیا تھا مگر دشمنوں کی پروپیگنڈہ مشینری بدستور حرکت میں تھی اور انہی پامال راستوں پر جا رہی تھی۔

شملہ کانفرنس کے دوران انعقاد میں مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو شدت سے ٹھکرایا گیا۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے مسلمان نشستوں میں سے دو کانگریس ہتھیاری تھی اور ایک پنجاب کے یونینسٹ وزیر اعظم اور یہ لوٹ اس لئے بچ رہی تھی کہ مسلمانان ہند کسی مرکز و واحد سے وابستہ نہیں سمجھے جاتے تھے۔ انھیں صیہ زبوں سمجھا جا رہا تھا کہ جو جس کے ہاتھ لگا وہ اسی کا ہو گیا۔ قائد اعظم نے اس بہودہ دعویٰ کو مبارکی ہمیشہ کے لئے باطل کر دینے کے خیال سے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ جلد از جلد انتخابات نو کریں اور مسلم لیگ کو موقع دیں کہ وہ اپنا دعوے نمائندگی ثابت کر سکے۔ اس نئے کانگریس کو لٹکا کر کہ وہ انتخابی میدان میں آئے اور

پاکستان اور قائدِ مسلم کے مسئلہ پر لڑ کے دیکھ لے۔

انتخابات کا اعلان ہو گیا، کانگریس، اس کے حواری، اس کے کرایہ دار، خشرات المراض کی طسرح مقابلہ میں آؤٹے۔ ضمنی انتخابات نے جن پر وہ پگینڈائی اور سیاسی تلواروں کو کندا اور ناکارہ بنا دیا تھا وہ ہوبانی گونروں نے اپنی کارگر اختیاراتِ خصوصی سے صیقل کر کے دیں۔ یہ تلواریں چمکیں، تڑپیں، ٹوٹیں اور گریں مرکزی اسمبلی سے پہل ہوئی۔ مسلم لیگ نے سو فیصدی کامیابی حاصل کی۔ کئی جگہ مخالفین کی ضمانتیں تک ضبط ہو گئیں۔ صوبوں کی باری آئی، سب بت ایک ایک کر کے خاکِ ذلت پر جا گرے۔ چار صوبوں میں مسلم لیگ نے سو فیصدی مسلم نشستیں جیتیں۔ صرف سرحد میں اس کی کامیابی پینتالیس فی صدی تھی۔ دیگر صوبوں میں اتنی اور نوے فی صدی۔ مجموعی کامیابی نوے پچانوے فی صدی تھی۔ جمہوریت کی ساری تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ ایک سیاسی جماعت نے انتخابات میں اتنی عظیم اکثریت حاصل کی ہو اور مخالفین کو اس بری طرح کچھاڑا ہو۔

ہندی انتخابات عام سے پہلے جمہوری اور پارلیمانی طرز حکومت کا گہوارہ یعنی خود انگلستان اس محرکہ انتخاب سے دوچار ہو چکا تھا۔ جس نے چرچل جیسے ناقابل شکست قائدِ حزبِ کائٹ الٹ دیا تھا۔ حزبِ عمال نے انتخاباتِ عمومی میں غیر متوقع اور غیر معمولی کامیابی حاصل کی تھی، اس کافی صدی تناسب بشکل ساٹھ تھا۔ خود ساٹھ فی صدی کامیابی حاصل کر کے حکومت پر قابض ہو جانے والے انگلستانی وزراء نے دیکھا کہ مسلم لیگ سو فی صدی کے لگ بھگ کامیابی حاصل کر کے بھی صوبائی وزارتوں سے محروم رکھی گئی۔ یہ سیاسیاتِ ہند کا دلچسپ معرکہ تھا۔ پنجاب کی وزارت اس حضرات کو تفویض کی گئی جس کی پارٹی کے ارکان کی تعداد ایک سو پچتر ارکان کے ایوان میں دس سے زیادہ تھی۔ اس کے مقابلہ میں مسلم لیگ کی وہ پارٹی تھی جس کی قوت اتنی ارکان سے بھی زائد تھی۔

یہ ستم ظریفی، یہ تضاد تاجے؟ ہاں اسی کی جو جیتا!

حکومت عمال کب تک خاموش تماشائی رہتی؟ انتخاب سے پیشتر ایک پارٹی کی حیثیت سے اس نے بلند بانگ دعاوی اٹھائے تھے۔ ہر انتخابی مہم کے موقع پر مخالف جماعتیں ایسے ہی دعوے باندھتی ہیں لیکن

چیننے والی جماعت کو اپنے عہد و پیمان کی کچھ نہ کچھ لاج ضرور کھنی پڑتی ہے۔ یوں بھی شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد لارڈ ویول وائسرائے ہند نے ملک معظم کی حکومت کی طرف سے ۱۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو یہ اعلان کیا تھا کہ انتخابات کے نتائج نکل آنے پر جتنا جلدی ممکن ہوگا ایک مجلس دستور ساز مرتب کی جائے گی۔ اس کی ترتیب کے لئے وائسرائے مرکزی صوبائی اسمبلیوں اور ریاستی نمائندوں سے گفت و شنید کریں گے اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ آیا کرسٹیاؤں کا قابل قبول یا قابل عمل ہیں یا کسی تبادل یا اصلاح یافتہ تجویز کو ترجیح دی جائے۔

اٹلی کی حکومت نے بالآخر ہندوستان کی طرف توجہ منعطف کی اور اس سلسلہ کو از سر نو شروع کیا جو شملہ تک پہنچ کر ٹوٹ گیا تھا۔ ہمارا مارچ ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم برطانیہ نے دالالعوام میں اعلان کیا کہ کاہینہ کے تین وزراء یعنی لارڈ پیٹک لارنس (وزیر ہند)، سر شیونورڈ کریس (صدر تجارتی بورڈ) اور سر لے۔ وی ایگریڈ (وزیر البحر) مغرب ہندوستان جائیں گے تاکہ وائسرائے اور ذمہ دار سیاسی قائدین کی مدد اور تعاون سے اس ملک کے لئے حکومت خود اختیاری کا راستہ صاف کریں۔ مشراٹلی نے کہا:-

میں بخوبی آگاہ ہوں کہ جب میں ہندوستان کا ذکر کرتا ہوں تو میں ایسے ملک کے متعلق بات کرتا ہوں جو سلوں انبانوں اور مذاہب کا عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ میں ان مشکلات کو اچھی طرح جانتا ہوں جو بدیں وجہ پیدا ہو گئی ہیں لیکن ان مشکلات پر ہندوستانی خودی قابو پا سکتے ہیں۔

ہمیں اقلیتوں کے حقوق کا مناسب خیال ہے۔ اقلیتوں کو خوف سے آزاد رہنے کے قابل ہونا چاہئے۔ لیکن ہم اس کے مقابلہ میں اقلیت کو یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ اکثریت کی ترقی میں رکاوٹ بن جائے۔

ہم اپنی طرف سے ان مشکلات کا احسن سلطہ نہیں کر سکتے۔ ہمارا فرض اولین یہ ہے کہ ایسی صورت پیدا کریں جس سے فیصلے ہو سکیں۔

ہم ایک عارضی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ وائسرائے کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو۔ اور اس عرصہ میں کماٹین کی تدوین ہو رہی ہو ایک ایسی حکومت قائم رہے جسے ہندوستان کی طرف سے زیادہ سے زیادہ تائید حاصل ہو۔

حزب عمال جب محض ایک سیاسی پارٹی تھی اور فائز اقتدار کی بجائے اس کا درجہ حزب مخالف کا تھا تو پروپیگنڈائی اعتبار سے اس نے بہت سے سبز باغ تخلیق کر رکھے تھے۔ وہ اپنی اشتراکیت کو برطانوی قوم کے علاوہ انسانیت تک کے لئے آپ جیات سمجھتی تھی۔ لیکن یہ غیر ذمہ دارانہ باتیں وہی افراد یا گروہ کر سکتے ہیں جو کاروبار حکومت کی گرانباریوں سے سبکدوش ہوتے ہیں۔ شش سالہ جنگ عالمگیر نے اقوام عالم کے لئے چند در چند شکلات پیدا کر دی تھیں۔ انسانیت ابھی تک اس قابوس کے چنگل سے رہا نہیں ہوئی۔ انگلستان جو سلسلہ حرب کی نمایاں کڑی تھا ان شکلات کا سب سے بڑھ کر شکار ہوا۔ اس کا ملکی نظام درجہ برہم ہو گیا۔ غیر متوازن و متزلزل اقتصادیات نے مجلسی صائب سے مل کر ایک مہرگیر خلفشار پیدا کر دیا تھا۔ ملک کی تباہ حالی، سرمایہ کی قلت، محنت کی جانفشانیاں، ضروریات زندگی کی کمی قیامت کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ ان غیر معمولی مصائب کے مقابلے کے لئے غیر معمولی فکر عظیم الشان منصوبہ بندی اور مکمل صلاحیت قوی کی اشد ضرورت تھی۔ حزب عمال، پروپیگنڈائی غوغا آرائی ایک طرف، چنداں نمایاں اہلیت و استعداد کی مالک نہیں تھی۔ اس میں استقامی قابلیت کی کمی تھی اور حکومتی تجربہ کا فقدان۔ ان شکلات میں انھیں اپنی دھاک بٹھانی تھی۔ انگلستان کو اقوام عالم کی صف اول میں بحال کرنا تھا اور اپنے اشتراکی اعلانات کی لاج رکھ کر ان وعدوں کو پورا کرنا تھا جو اس نے غیر ذمہ داری کے ایام میں غلام و محکوم ہندوستان سے کئے تھے۔ یوں بھی جنگ کے دوران میں آئینی مذاکرات کا جو سرچشمہ پھوٹا تھا اُسے پاشنا ناممکن تھا۔ اس کی روانی کو روکنا ممکن العمل۔

بین الاقوامی سیاست میں انگلستان کی بحالی آسان کام نہ تھا انھیں خطرہ تھا کہ اگر حزب عمال اس میں ناکام رہی تو اندرونی خلفشار اور خارجی حکمت عملی کی ناکامی مل کر ان کا ٹاٹ الٹ دیں گے۔ ہندوستان کے قضیہ نامرضیہ کا حل ضروری تھا لیکن حل اس نہج سے کہ ناکامی کی صورت میں ساری ذمہ داری ہندوستان کے سر تقویٰ جاسکے۔ اور کامیابی کی صورت میں اس کا نامے اور کارگزاری کی اندرون و بیرون ملک نمائش کر کے اپنی بحالی اور سر بندی حاصل کی جاسکے۔

وزیر اعظم برطانیہ کا بیان اسی کشمکش کا آئینہ دار تھا جو ان کے تحت الشعور میں خوابیدہ تھی۔ ... ہندوستان کی شکلات چندہ چند ہیں لیکن ان کا حل اسی کے اختیار میں ہے۔ ہم اس کے مہموں میں

اور حل کی تا مترجمہ داری اسی کی تھی، چنانچہ ایک طرف اقلیتوں کو چسکی کہ برطانیہ تمہارے مفادات و حقوق سے بخوبی آگاہ ہے اور وہ ایسی فضا کا متمنی ہے جس میں تم خوف سے آزاد ہو سکو۔ لیکن اس لیکن کے ایک ایک نقطہ میں وہ قہمیں نہاں تھیں جو تقسیم ہند کی ایک ہی گردش میں برپا ہو گئیں۔ لیکن اقلیتوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اکثریت کی ترقی میں رکاوٹ ڈال سکیں۔ اقلیت کو بے خوفی کا یقین دلا کر دیا گیا لیکن اکثریت کی راہ سے ہٹ جانے کی تہنہ کر کے دولتی بھی رسید کر دی گئی۔ اقلیتوں کے اس نامعقول ذکر نے مسلمانوں کو برہم کر دیا۔ انھوں نے اس لیکن کے ہم پر وہ ہندو انگریزی ناپاک سازش کے عفریت ناچتے دیکھے اور ہندو اکثریت نے اس عفرتی رقص کو آزادی کی سلیم پری کی چھاگل کی جھنکار سمجھا۔ آزاد، صدر کانگریس نے اس کا خیر مقدم کیا، گاندھی، مہاتما کانگریس نے اسے سراہا اور سیتا رامیہ، نقیب کانگریس نے اس پر خوشی کے شادیاں بجاے۔ قائد اعظم نے مخصوص انداز میں کمی اور کمزوری کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ کمزوری کمی کو دعوت دیتی ہے کہ جائے کے اندر آؤ۔ اگر کمی آنے سے انکار کر دے تو کمی پر رکاوٹ پیدا کرنے کا اعتراض وارد ہوگا اور اس کی روش کو غیر مصالحتانہ قرار دیا جائے گا۔ انھوں نے برطانیہ کو استباہ کیا کہ وہ جھوٹے پروپیگنڈے کے زیر اثر اقلیتوں کو باعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص کہ ہندی سیاست کے ضمن میں اقلیت سے مسلمان ہی مراد لئے جا رہے تھے، بنام کر رہے ہیں۔ قائد اعظم کے الفاظ میں وزیر اعظم جہوم سامعین میں کئی آوازوں سے بول رہے تھے۔ — درآئیں ایک مسلمان ایک آواز تھے۔ — تقسیم ہند اور قیام پاکستان!

انتخابات عمومی کے نتائج کے باوجود برطانیہ اقلیت و اکثریت کی دلدل سے نہیں نکل سکا تھا۔ وہ دقیانوسی عینک سے تماشگر رہا تھا۔ گذشتہ ناکامیابی اسی غلط بینی کی رہیں منت تھی اور وہ بدستور اسی کامریض تھا۔

ان حالات میں برطانوی وزارت کا وفد ہندوستان پہنچا۔ اب کے ان کے پاس ان کے قول کے مطابق کوئی معین نسخہ نہیں تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مقامی طور پر جملہ قائدین سے مل کر ایسی فضا پیدا کریں کہ وہ از خود کسی فیصلہ تک پہنچ سکیں۔ انھوں نے عہد کر لیا کہ وہ عاملہ بننا کہہ ہی وطن لوٹیں گے وہ اس جماعت یا فرد سے ملے جس کی سیاست میں کچھ حیثیت تھی اور جس کے متعلق خیال ہو سکتا تھا کہ وہ

اس ضمن میں کوئی رائے دینے کی اہمیت رکھتا ہے۔

مشن کی آمد کے سلسلہ میں کانگریس اور مسلم لیگ نے اپنے اپنے سیاسی مقاصد کی وضاحت کی۔ کانگریس اسی فرعونیت کی مظہر تھی جس کے افسوسناک مظاہرے کچھ عرصہ سے نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ وہ سیاسی آمریت کے خواب ہی نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ اسے مشکل ہوتا سمجھ رہی تھی۔ مشن کو اس نے اپنے فسطائیہ عزائم کا آلہ کار تصور کیا۔ پٹیل نے کہا:-

کانگریس دو قومی نظریہ کو ہرگز تسلیم نہیں کرے گی اور نہ وہ مذہب پر مبنی قومیت کا تصور قبول کرے گی۔ کانگریس صوبجات کی از سر نو تحدید کر کے ان علاقوں کو مکمل خود مختاری دینے کے لئے تیار ہے جہاں کی اکثریت مسلمان ہے لیکن یہ اس شرط سے مشروط ہوگا کہ ایک مضبوط مرکز موجود ہوگا۔ مضبوط مرکز و قلع ہند کے لئے ضروری ہے۔

پنڈت نہرو کا مطالبہ یہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی کو پوری طرح تسلیم کیا جائے اور ہندوستانیوں کو اپنے اختلافات رفع کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے کیونکہ تیسری قوت کی موجودگی میں ان اختلافات کا حل مشکل ہے۔ جب یہ طے ہو جائے گا کہ ہندوستان آزاد ہوگا تو اس کے مختلف فرقے اور گروہ یا تو مصالحت کر لیں گے یا آپس میں لڑیں گے تا آنکہ مصالحت ممکن ہو جائے۔

الغرض خدایاں کانگریس مسلمانوں سے سجدوں کا تقاضا کر رہے تھے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ جملہ اقلیتوں کو نظر انداز کر کے مرکزی حکومت کانگریس کے سپرد کر دی جائے۔ اسے وہ آزادی سے موسوم کرتے تھے یہ مسلط شدہ مرکزی حکومت ایک مجلس دستور ساز کی تشکیل کا حکم صادر کرے گی جس کا فریضہ تدوین آئین ہوگا۔ وزارتی مشن کے پیش نظر مسئلہ ہند کا مستقل حل تھا اس لئے مسلم لیگ نے اپنا قطعی مطالبہ پیش کیا۔ مسلمان نام نہاد قومیت متحدہ ہند یہ کا جز یا ایک فرقہ نہیں۔ وہ جداگانہ ملت ہیں۔ لہذا برصغیر ہند کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے ایک پاکستان اور دوسرا ہندوستان۔ اس تقسیم کا اعلان کر کے دو مجالس دستور ساز مرتب کی جائیں جو دونوں علاقوں کے لئے جداگانہ آئین مرتب کریں اور آزاد پاکستان اور آزاد ہندوستان

کی تشکیل کریں۔ جہاں تک عارضی مرکزی حکومت کا تعلق ہے اس پر غور کا اس وقت تک سوال پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ مطالبہ پاکستان بطور شرط قدم اول تسلیم نہیں کر لیا جاتا۔

یہ ملی مطالبہ مسلم ارکان مجالس مقننہ کی اس تاریخی کنونشن اپریل ۱۹۴۷ء میں مرتب ہوا جس میں مختلف امتحان انتخابات پانچ سو سے زائد تعداد میں جمع ہوئے اور شہادت پاکستان کا حلف اٹھایا۔ اس کنونشن نے دوسری مجلس دستور ساز کا نوڈ پیش کر دیا جس کا مطالبہ اس کی منظور شدہ قرارداد میں ہوا تھا۔

وزارتی مشن پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کے متصادم مطالبات کے سایہ میں مصروف کار ہوا۔ اپریل کا سارا مہینہ مذاکرات میں گذرا۔ متصادم و متخالف نظریات میں کوئی قدر مشترک نہ مل سکی۔ ہر مئی کو شملہ کی جنگ فضا میں وزارتی مشن نے قائدین لیگ و کانگریس کی مشترکہ کانفرنس طلب کی جو نتیجہ فی ثابث نہ ہوئی اشتراک باہمی کی ناپایب متاع کی بیسار و لے بے سود تلاش کے بعد آخر کار مشن نے بہ شمولیت وائسرائے اپنا بیان دیا اور وہ طریق کار بتایا جس کے مطابق ان کے نقطہ نگاہ سے متعلقہ فریق اپنے اختلافات کو رفع کے تدوین آئین سے متعلق کسی ایک فیصلہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس بیان میں مشن نے اعتراف کیا کہ انصوں نے ملاقاتوں سے نتیجہ نکالا ہے کہ مسلم لیگ کے علاوہ ہر گروہ وحدت ہند کا خواہشمند ہے۔ شاید اسی اتفاق اور ایک زبانی 'کانٹینجہ تھا کہ مشن پاکستان کی معقولیت کا انکار نہ کر سکنے کے باوجود اس کے حق میں دو ٹوک فیصلہ نہ دے سکا۔ مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا گیا:

مسلم لیگ کے تصور کا پاکستان پنجاب، سندھ، سرحد، برطانوی بلوچستان، بنگال اور آسام کے صوبجات پر مشتمل ہوگا۔ مسلم لیگ مسئلہ تحدید پر بعد میں غور کرنے کے لئے تیار ہے لیکن وہ اصولی پاکستان کی فوری منظوری چاہتی ہے۔

ان صوبجات کی ہندو مسلم آبادی کی تعداد تناسب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا:

آبادی کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ جس قسم کے پاکستان کا مسلم لیگ مطالبہ کر رہی ہے اس کے قیام سے نہ تو فرق وارانہ مسئلہ حل ہو جائے گا اور نہ ہم یہ وجہ جواز دیکھتے ہیں کہ پنجاب اور بنگال کے ان اضلاع اور آسام کو جس میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے آزاد پاکستان میں شامل کر دیں۔

ہر وہ دلیل جو پاکستان کے حق میں دی جاسکتی ہے وہ ہمارے خیال میں ان علاقوں کے پاکستان سے نکال دینے کے حق میں بھی اسی طرح استعمال ہو سکتی ہے۔ یہ معاملہ سکھوں پر خصوصیت سے اترنا از ہوگا۔

چنانچہ ہم نے اس پر غور کیا کہ آیا کچھ چھوٹا آباد پاکستان جو مسلم اکثریت کے علاقوں پر ہی مشتمل ہو مصالحت کی اساس بن سکتا ہے؟ ایسے پاکستان کو مسلم لیگ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ کیونکہ اس طرح پنجاب میں سے اناہ اور جالندھر ڈویژن، آسام سے سلہٹ کے علاوہ دیگر سارا علاقہ اور بنگال سے مغربی بنگال کا معتد بہ حصہ بمعہ کلکتہ پاکستان سے نکل جاتے ہیں ہم خود محسوس کرتے ہیں کہ مشترکہ زبان، تاریخ اور روایات کے پیش نظر بنگال اور پنجاب کی تقسیم مناسب نہیں۔ مزید برآں پنجاب کی تقسیم سکھوں کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دے گی۔ فلہذا ہمیں اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا ہے کہ پاکستان کلاں یا پاکستان خورد کی آزاد ریاست فرقة دارانہ مسئلہ کا قابل قبول حل مہیا کرنے سے قاصر ہے۔

چنانچہ مشن نے انتظامی، اقتصادی، عسکری، مواصلاتی اور جغرافیائی اعتبارات اور ریاستوں کے نقطہ نگاہ سے اس رائے کا اظہار کیا کہ

اندریں حالات ہم بھارتی حکومت کو یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ وہ سیاسی اختیارات دو علیحدہ حکومتوں کے سپرد کر دے۔ اس رائے کے باوصف ہم مسلمانوں کے ان بالکل حقیقی خدشات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ وحدت ہند کی صورت میں ہندوؤں کی کثرت تعداد ان کی ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کو کا لعدم کر دے گی۔ کانگریس نے اس کا حل یہ سوچا ہے کہ صوبجات کو مکمل خود مختاری حاصل ہو اور مرکز کے اختیارات کم سے کم مرکزی شعبوں سے متعلق ہوں جیسے امور خارجہ، دفاع اور مواصلات، اس تجویز کے مطابق صوبے رضامندی سے اپنے کچھ اختیارات مرکز کے حوالہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں کئی آئینی الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ یہ الجھن اور مشکل مرکز میں اور نمایاں ہو جائے گی۔ جہاں اختیاری (Optional) اور

جبری (Compulsory) اختیارات سے متعلق دزیروں کو پونے کی اجازت دی جاسکے گی اور بعض کو روکا جاسکے گا۔ اس وقت کے علاوہ صوبوں کو اس سے باز نہیں رکھا جاسکے گا کہ وہ جس ضرورت کے تحت بعض اختیارات مرکز کے حوالہ کریں اسی ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے اشتراک عمل کر کے محراب (Grouping) کر لیں۔ لیکن یہ روش ان کی صد خود مختاری سے باہر ہوگی۔

ریاستوں کا ذکر کرتے ہوئے مشن نے کہا:

یہ ظاہر ہے کہ برطانوی ہند کے اندرون یا بیرون دولت مشترکہ آزادی حاصل کر لینے کے بعد ریاستوں اور تاجِ برطانیہ کے درمیان جو تعلقات اب تک رہے ہیں وہ ممکن نہیں رہیں گے، انتہائی اعلیٰ ذرائع برطانیہ کے پاس رہ سکتا ہے نہ حکومتِ ہند کو منتقل کیا جاسکتا ہے۔ ریاستوں نے یہ یقین دلایا ہے کہ پورے تعاون کے لئے تیار ہیں۔ ان کا تعاون کس شکل میں ہو یہ منحصر ہے اس مصانحت پر جو تدوینِ آئین کے دوران میں طے پائے گی۔

اب ہم وہ حل پیش کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک متفرق فریقوں کے ضروری مطالبات کا عادلانہ حل ہے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ آئین کی تدوین اس اساس پر ہو:

(i) برطانوی ہند اور ریاستوں کو ملا کر ایک متحدہ یونین بنائی جائے جو امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے محکموں کی ذمہ دار ہو۔ جیسے اختیارات کی مالک ہو کہ ان امور کے لئے مطلوبہ اخراجات مہیا کر سکے۔

(ii) یونین کی ایک انتظامیہ (Executive) ہو اور ایک مقننہ (Legislature) جو برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں۔ کسی اہم فرقہ وارانہ مسئلہ کے فیصلہ کے لئے مقننہ میں دونوں فرقوں کے حاضر اور ووٹ دینے والے ارکان کی (علیحدہ علیحدہ) اکثریت نیز کل حاضر اور ووٹ دینے والے ارکان کی اکثریت درکار ہوگی۔

(iii) یونین کے محکموں کے علاوہ محکمے اور اختیارات مابقی صوبوں کے قبضہ میں ہوں گے۔

(iv) راستوں کے پاس وہ تمام اختیارات رہیں گے جو انہوں نے مرکز کے سپرد نہیں کر دیے۔

(v) صوبوں کو اختیار ہو گا کہ وہ مستقل اور متعلقہ مجالس سمیت تحریک (Grouping) کر لیں اور حزب

(Group) طے کرے کہ کون سے صوبائی اختیارات مشترک کر لئے جائیں۔

(vi) یونین اور احزاب (Groups) کے آئین میں یہ شق موجود ہونی چاہئے کہ ہر صوبہ اپنی مجلس

مقننہ کی اکثریت رائے سے مطالبہ کر سکتا ہے کہ دس سال کے ابتدائی عرصے کے بعد اس کے بعد ہر دس سال کے خاتمہ پر آئین پر نظر ثانی کی جائے۔

ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ان خطوط پر آئین کی تفصیلات متعین کریں بلکہ ہمارا مقصد ایسا نظام پیدا کرنا ہے جس میں ہندوستانی ہندوستانیوں کے لئے آئین ترتیب دیں۔

یہ سفارشات جو آئین مستقبل کی عام اساس ہوں گی ہیں اس ضرورت کے تحت کرنا پڑی ہیں کہ دو سالہ مذاکرات میں ہم نے دیکھا کہ جب تک یہ نہیں ہو جاتا دو اہم فرقوں کو تدرین آئین کے کاروبار میں اشتراک عمل پر آمادہ کرنے کی کوئی امید نہیں رہے گی۔

اب ہم تدرین آئین کے مجوزہ طریق کار کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔

آئین کے متعلق فیصلہ کرنے والی مجلس (Assembly) کے لئے ضروری ہے کہ وہ ممکن طور پر زیادہ سے زیادہ آبادی کی عمومی نمایندہ ہو۔ اس نمایندگی کے لئے رائے دہندگی بالغان لازمی ہے اس طریق کار میں جو ناگزیر تاخیر ہے اس سے بچنے کی صورت یہی ہے کہ موجودہ صوبائی مجالس مقننہ کو استعمال کیا جائے جن کے انتخابات حال ہی میں ہوئے ہیں۔ لیکن اس میں قباحت یہ ہے کہ مذکورہ مجالس صوبائی آبادیوں کی صحیح آئینہ دار نہیں۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ان بے قاعدہ گروپوں کے دور کرنے کی مصفاہ اور قابل عمل صورت یہ ہے کہ

۱) ہر صوبے کے لئے آبادی کے مطابق نشستیں اس طرح مخصوص کر دی جائیں کہ تخمیناً دس

لاکھ آبادی کا ایک نمائندہ ہو۔

۲) یہ مخصوص نشستیں صوبوں کی فرقہ وارانہ تناسب آبادی کے مطابق متعلقہ فرقوں میں تقسیم کی جائیں

ج) یہ گنجائش رکھی جائے کہ ہر فرقہ کا صوبائی تعداد ارکان اسی فرقہ کے ارکان مجلس متعین منتخب کریں
ہم سمجھتے ہیں کہ ان مقاصد کے لئے یہ کافی ہوگا کہ صرف تین فرقے یعنی 'عام' (General)
مسلم اور سکھ تسلیم کئے جائیں۔ 'عام' میں وہ تمام لوگ آجائیں گے جو مسلم یا سکھ نہیں۔
طرز انتخاب متناسب نمائندگی پر مبنی ہوگا اور واحد انتقال پذیر ووٹ (Single
(transferable vote) سے طے پائے گا۔

(صوبائی اجراء کے) فریق و میں مدراس، بمبئی، یوپی، بہار سی پی اور اڑیسہ کے صوبیات
ہوں گے، فریق ب میں پنجاب، سرحد اور سندھ، اور فریق ج میں بنگال اور آسام۔
دہلی اور اجیرا، راولپنڈی کے نمائندگان مرکزی اسمبلی، نیز کوئٹہ کے ایک منتخب نمائندہ فریق
(Section) و میں شامل ہوں گے اور بلوچستان کا ایک نمائندہ فریق ب میں شریک ہوگا۔
یہ تمام نمائندگان نئی دہلی میں تبدیلی اجتماع کے بعد، ب اور ج فریقوں میں بٹ جائیں گے
یہ فریق ان صوبوں کی تدوین آئین کریں گے جو ان کے اجزا ہوں گے۔ وہ یہ بھی فیصلہ کریں گے کہ
آیا ان صوبوں کے لئے حزبی آئین (Group Constitution) ترتیب دیا جائے یا نہ۔ ایسا آئین
ترتیب دینے جانے کی صورت میں وہ یہ بھی فیصلہ کریں گے کہ متعلقہ حزب کن شعبوں کو قبضہ میں لے۔
صوبوں کو اجراء سے خارج ہونے کا اختیار ہوگا یہ فیصلہ نئے آئین کے مطابق انتخاب ہو چکنے کے بعد
متعلقہ صوبائی اسمبلی کرے گی۔

فریقوں کے نمائندے اور ہندی ریاستیں باہم ملیں گے تاکہ یونین کا آئین مرتب کریں۔
یونین کی مجلس دستور ساز میں اس (بنیادی تجویز) کی تبدیلی کے لئے نیز باہم فرقہ دارانہ مسائل
سے متعلق تجاویز کے تصفیوں پر سے فرقوں کے حاضر اور ووٹ دہنے والے نمائندوں کی اکثریت
دیکھا ہوگی۔

بلکہ تدوین آئین کا کام ان خطوط پر ہوگا کہ حکومت کے نظم و نسق کو چلانے اور دیگر امور
ہم (دین کی طرف اشارات ہیں) سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک نمائندہ حکومت کی ضرورت ہوگی

دائسرائے نے اس ضمن میں ضروری مذاکرات شروع کر دیے ہیں اور ان کی توقع کے مطابق ایک عبوری حکومت عنقریب تشکیل پذیر ہو جائے گی جس میں دکن جنگ سمیت سب سرشتے ان ہندوستانی رہنماؤں کے سپرد ہوں گے جنہیں عوام کا اعتماد حاصل ہوگا۔

یہ ہے خاکہ ان سفارشات کا جنہیں برطانوی وزیر نے سیاسی جماعتوں میں عدم مفاہمت کی صورت میں بطور اساس کے پیش کیا۔ برطانوی وزیر نے اس تجویز میں نیز اس کے علاوہ بیانات اور لاقاؤں میں اپنے خلوص اور اعتدال پسندی کا خوب ڈھنڈورہ پیٹا۔ اس وقت اس بحث میں جانے سے کچھ حاصل نہیں کہ آیا ان کی یہ ماعی مخلصانہ تھیں یا منافقانہ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے دل و دماغ میں پہلے سے چند ایسے مسلمات تھے جو ان کی نیک نیتی تسلیم کی جائے تو کہتا پڑے گا کہ وہ غیر شعوری طور پر ان مسلمات کے زیر اثر رہے۔ ہند کے برصغیر کی جغرافیائی وحدت کی دلیل غیر معقول ہے۔ اس لئے نہیں کہ یہ خطا ارض متصل۔ لہذا واحد نہیں، بلکہ اس لئے کہ سیاسی وحدت جغرافیائی وحدت کا لازمی نتیجہ نہیں۔ جغرافیہ کے اپنے اصول ہیں اور سیاست کے اپنے۔ ہندوستان کی سرحد ایران سے ملتی تھی، ایران کی اور مالک سے۔ لیکن یہ جغرافیائی رشتہ انہیں ایک سیاسی نظام میں مربوط و متحد نہیں کر سکا۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جب تک جغرافیہ کو تاریخ کی حاویت حاصل نہ ہو اس کی کئی حد بندیاں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ یورپ ایک بین جغرافیائی وحدت ہے تاہم ان جغرافیائی حدود کے اندر تاریخ و سیاست نے اپنی جداگانہ میوں صدیوں قائم کر رکھی ہیں جغرافیائی اصولی مسلم، لیکن انسانی قلب و نگاہ سے ابھرنے والی ان 'حدوں' کا کیا توڑ، جن سے انسان ناقابل شکست قومی وحدتوں میں منقسم ہو گیا ہے۔ برطانیہ نے ہندوستان میں جغرافیہ کے انہی کتابی اصولوں کو اساس استدلال بنایا جنہیں انسان نے کرۂ ارض کے بیشتر قطعوں میں صدیوں سے پامال کر رکھا تھا۔

ایک طرف ہندوستان کا برصغیر اس نام نہاد وحدت کا نمونہ پیش کرتا تھا جو محض جغرافیہ کے نزدیک مسلم تھی اور دوسری طرف انگریزی اقتدار نے ڈیڑھ سو برس کی سیاسی 'منمت' سے اس وحدت کو تاریخ و سیاست کی مدد سے طبع کی حد سے کچھ آگے بڑھا دیا تھا۔ یہ وحدت چونکہ انگریزی کی اپنی کوششوں بلکہ بالفاظ صحیح تر مصلحتوں اور ضرورتوں کا نتیجہ تھی اس لئے وہ غیر شعوری طور پر اس تاریخی منمت کا ضیاع برداشت

نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے ہندی انتخابات ممبرین نتائج تھے۔ ان کو کہیں کم نتائج نے انگلستان میں قدرت پسندوں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ لیکن وہ اپنے مسلمات کو اس قدر بنیادی طور پر بدلتے کے لئے تیار نہ تھے کہ ہندوستان کو واحد ملک سمجھنا چھوڑ دیں اور مسلمانوں کو ایک موہوم ہندی قومیت کا ایک فرقہ سمجھنے کی بجائے ایک مستقل قوم کہنا شروع کریں۔ چنانچہ ان کی کوششوں کے چٹھے اسی سوت سے پھوٹے کہ ہندوستان ایک ہے اور اسے ایک ہی رہنا چاہئے۔ ۱۹۴۷ء میں بھارت نے اعلان کیا تھا کہ وہ کوئی ایسا آئین تسلیم نہیں کرے گا جسے ہندوستانی اقلیتیں منظور نہ کریں۔ ۱۹۴۷ء سے لیکر اب تک اس نے تجربے سے دیکھ لیا تھا کہ وحدت ہند کا تصور مسلمان کے نزدیک ناقابل برداشت تھا۔ ملت اسلامیہ جمہوری قواعد کے مطابق انتخابات میں دشمنان پاکستان کو شکست فاش دے چکی تھی۔ لیکن جمہوریت کے نقیب انگریز اس خالصتہ جمہوری طرز سے مرتب نتیجہ کا عملاً انکار کر رہے تھے۔

وزارتی مشن نے ہر چند صوبائی تحریک کی شرط لگا کر پاکستانی صوبوں کو محفوظ کر لیا اور ان کی خود مختاری اور مرکز کی کمزوری سے مسلمانوں کی تالیفِ قلوب کی کوشش ضرور کی وہ اس حد تک مستحسن بھی سمجھی گئی لیکن اس نے اعلیٰ نیر پاکستان کی مخالفت کی اور بزعم خود اسے مسترد کر دیا۔ یہ لفظی استرداد اپنا اثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ مسلمان براہِ تبدل ضرور ہوا مگر اس نے من حیث القوم رائے زنی سے اس وقت تک جناب کیا جب تک کہ سفارشات زیر نظر کے مالہ ویا علیہ پر کما حقہ غور نہیں کر لیا۔ اس کے برعکس بندوؤں کے ہاں گھی کے چراغ جلے اور انھوں نے — غالباً — بلا سوچے سمجھے یہ سن کر اور پڑھ کر بھارتی مشن نے پاکستان — خورد و کلاں — کو مسترد کر دیا ہے خوشی کے شادیاں نے بجائے۔ مٹر گاندھی نے اس تجویز میں وہ جراثیم دیکھے جو اس بد قسمت ملک کو خوش قسمت بنا دیئے کے ذمہ دار ہو سکتے تھے۔ ہندو کے زبان و قلم اس خوش آمد تجویز کے حق میں رطب اللسان تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر مسلمانوں کی قیادت ان سے مرکب ہوتی جو جذباتی ہوتے اور معاملہ پر خط سلطنت سے نگاہ ڈالتے تو مشن کے یہ غیر معتدل الفاظ یقیناً اس تجویز کے استرداد میں مانع ہوتے۔

اس نظری بحث اور مشن کے اپنے میلانات کو چھوڑتے ہوئے بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مشن نے کانگریس اور مسلم لیگ کے متضاد مطالبات میں وجہ اشتراک پیدا کرنے کی دلیرانہ اور قابل تعریف کوشش کی۔ کانگریس وحدتِ ہند کی متقاضی تھی مگر مسلم لیگ کی مخالفت سے مجبور ہو کر اس نے کہا شروع کر دیا تھا کہ وہ کسی علاقے کو اس کی منشا کے خلاف مرکز کے ماتحت نہیں رکھ سکتی۔ مسلم لیگ چھ صوبوں کا مرکز سے مکمل انقطاع چاہتی تھی۔ مشن نے کانگریس کی خوشنودی کے لئے مرکز ضرور قائم رکھا لیکن مسلم لیگ کی خاطر اس کا دائرہ عمل یہاں تک محدود کر دیا کہ صرف تین شعبے اس میں رہ گئے۔ اس کے ساتھ ان کی یہ شرط کہ مرکز کو مطلوبہ اخراجات ہیبا کرنے کے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں مسلم لیگ اور کانگریس میں وجہ نزاع بن گئی۔

کانگریس مرکز کو مضبوط بنانے کے خیال سے اس کا مفہوم یہ لے رہی تھی کہ مرکز اس مطلب کے لئے ٹیکس عائد کرے گا مگر مسلم لیگ مرکز کو یہ مزید اختیار دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ صوبے مرکز کو ضروری اخراجات دے دیا کریں لیکن ٹیکس عائد کرنے اور وصول کرنے کے ذمہ دار وہ خود ہوں نہ کہ مرکز۔ یہ امور باہمی گفتگو سے طے ہو سکتے تھے مگر کانگریس کی خود سری اور ضد نے یہ نوبت نہ آنے دی اور آخر دم تک کوئی معاہدہ نہ ہو سکی۔

کانگریس کے مرکز قائم رکھنے کا مطالبہ تو تسلیم کر لیا گیا لیکن مرکز کو کمزور نہ دیا گیا تھا۔ ان کے مطالبہ میں یہ تخفیف روا رکھی گئی تو اس کی تلافی یوں کر دی گئی کہ مسلمان اکثریت والے صوبوں کو مرکز سے علیحدہ نہیں ہونے دیا بلکہ ان کے زیر اطاعت رکھا۔ اس طرح مسلم لیگ کی مخالفت کے علی الرغم کمزور مرکز تو مسلط کر دیا گیا مگر ان کی تسلی کے لئے چھ صوبوں یعنی آسام اور بنگال کو فریقِ ج میں اور پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو فریقِ ب میں داخل کر کے ان کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دیدی اور اس طرح اکھنڈ ہندوستان اور پاکستان میں مطابقت پیدا کر دی۔ صوبائی حزب میں پھر اکھنڈ ہندوستان کے لئے یہ رعایت رکھی گئی کہ نئے آئین کے بعد منتخب اسمبلیاں یہ فیصلہ کرنے کی مجاز ہوں گی کہ کوئی صوبہ متعلقہ صوبائی حزب میں نہ رہے لیکن پاکستان کی رعایت کے لئے اس صوبائی حزب کو ابتداً جبر

قراردیا یعنی کسی صوبے کو یہ اختیار نہیں کہ وہ متعلقہ فریق میں شامل نہ ہو۔ محض یہی نہیں بلکہ شمولیت کے بعد صوبوں پر اوپابندی بھی تھی۔ تحریک کی صورت میں جو مشترکہ شعبے اجزائی مرکز میں رکھے جانے تھے ان کا فیصلہ متعلقہ حزب کرے گا۔ کھوپہ خود۔ مثلاً فریق ب میں صوبہ سرحد جو اس وقت کانگریس وزارت کے زیر اقتدار تھا اور جس کی آزادی کانگریس کی طرف سے خصوصیت سے ڈھنڈورہ پٹیا جانا تھا مجبور تھا کہ فریق ب میں شامل ہو۔ اس شمولیت سے سرزانی خارج از بحث تھی۔ مزید برآں تدوین آئین کے وقت فریق ب کے چاروں صوبے مل کر یہ فیصلہ کرتے کہ صوبے (بشمول سرحد) کون کون سے اختیارات اس اجزائی مرکز (جس کی حیثیت آل انڈیا مرکز کے ماتحت مرکزی ہوتی) کو دیتے۔ گویا اس حد تک تو اس مصنوعی کانگریس صوبے پاکستان کا پابند بنا دیا گیا تھا لیکن اس صوبائی حزب کی نگرانی میں تیار کئے ہوئے آئین کے مطابق منتخب اسمبلی کو یہ اختیار دیا گیا کہ اگر وہ کثرت رائے سے یہ فیصلہ کر لے کہ صوبہ سرحد کو اس حزب میں نہیں رہنا چاہئے تو یہ صوبہ مذکورہ حزب سے نکل سکتا ہے۔

مسلم لیگ کے لئے یہاں رعایت تھی۔ وہ چھ صوبے جن کو پاکستان میں شامل کرنے کا وہ مطالبہ کر رہی تھی اسے بچھہ مل رہے تھے کانگریس ان فوڈاس کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس کا اعتراض خصوصیت سے دو صوبوں پر تھا۔ ایک طرف آسام تھا اور دوسری طرف سرحد۔ آسام جس کی آبادی کا ایک تہائی حصہ ہندو تھا اور باقی غیر ہندو۔ کانگریس پرو پیگنڈے اور برطانوی نوازشات کے بدلے میں ہندو صوبہ سمجھا جا رہا تھا۔ کیونکہ آئینی طور پر آبادی یا مسلم تھی یا 'عام' (General) اس 'عام' کے تحت تمام غیر مسلم آجاتے تھے اور انھیں عموماً ہندو سمجھا جاتا تھا۔

سننا یہاں یہ کہنا خالی اندکچی نہ ہوگا کہ خود وزارتی مشن کی سفارشات میں بھی ہی 'رعایت' موجود تھی۔ ہر شخص جو غیر مسلم اور غیر سکھ تھا وہ عام — ہندو — تھا۔ آسام کی آبادی میں بحیثیت واحد جماعت مسلمان اکثریت میں تھے۔ نیز اس کی آبادی کے دیگر غیر مسلم عناصر بلکہ مقامی ہندو عنصر کا معتد بہ حصہ وراثت ہندو کے حق میں تھا۔ وہ اپنے جداگانہ حقوق طلب کر رہے تھے لیکن بد قسمتی سے آسام کی آبادی جو قبائلیوں اور پمانہ اقوام پر مشتمل ہے اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی کہ وہ اپنے سیاسی حقوق کا

زیادہ وسیع کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن اب اس نے صوبائی خود مختاری کے نام پر یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ صوبے
 تحریک میں مجبور و پابند ہیں۔ مشن کو بارہا اپنے بیانات میں اس شق کی وضاحت میں کہا ہے کہ صوبوں کا تحریک
 جبری ہے البتہ نئے آئین کے بعد نئی اسمبلی کی کثرت رائے سے وہ حزب متعلقہ سے نکل سکتے ہیں لیکن مصنف
 کے اس بیان کے باوجود کانگریس اسی ضد پر قائم رہی کہ ان کی توجیہ صحیح اور مسلم لیگ بلکہ خود مشن کی توجیہ
 غلط۔ صوبائی تحریک سے متعلق شق نے خوب گل کھلائے اور آخر الامر اس اقدام کے لئے راستہ صاف کر دیا
 جس سے بچنے کے لئے کانگریس یہ مجبوزمانہ ننگ و تاز کر رہی تھی۔

فرق ب اور ج میں مسلمان نشستوں کا مناسب پچاس فیصدی سے زیادہ تھا۔ فرق ج کی
 مجموعی نشستوں میں سے چھتیس مسلمانوں کی تھیں۔ گزشتہ انتخابات کے باعث پینتیس تمام کی تمام
 مسلم لیگ کے قبضہ میں تھیں۔ اس کے برعکس عام چونتیس نشستوں میں بعض یورپیوں کو بھی مل سکتی تھیں،
 کیونکہ بنگالی اور آسام کی اسمبلیوں میں ان کی کافی نمائندگی تھی۔ ان کے آنے سے کانگریس کی تعداد ارکان
 چونتیس سے بھی کم رہ جاتی۔ چنانچہ کانگریس نے یہ شوشہ چھیڑا کہ یورپیوں کو حق نیابت نہیں دینا چاہئے، مہربان
 اور سنی وزارتیں مشن نے فوراً یہ مطالبہ بھی منظور کر لیا اور کانگریس کا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا کہ گو مسلمانوں کے ارکان
 کم نہیں ہوئے ان کے توڑ بھ گئے۔

مشن کی تجویز کے مطابق صوبائی احزاب تین مرکزی شعبوں کے علاوہ آئین سازی میں خود مختار تھے
 مسلم لیگ کا مطالبہ مکمل انقطاع اور قیام پاکستان کا تھا جسے مشن نے لفظی طور پر مسترد کر دیا تھا۔ مگر آئین
 میں یہ گنجائش رکھ دی گئی کہ کوئی صوبہ اسمبلی کی کثرت رائے سے دس سال کے بعد آئین پر نظر ثانی کا مطالبہ
 کر سکتا ہے۔ یہ شق اس لحاظ سے مفید تھی کہ مشن نظر تجویز کے مطابق ایک آئین مرتب کر لیا جائے اور اسے دس
 سال تک چلایا جائے، پھر تجربہ کی روشنی میں اس پر اگر ضرورت ہو تو۔ نظر ثانی کر لی جائے۔ انسان کا بنایا ہوا
 کوئی آئین مکمل اور قطعی نہیں ہو سکتا۔ اس میں وقتاً فوقتاً مقتضیات کے مطابق اصلاح و ترمیم ناگزیر ہو جاتی ہے
 لیکن اس پر اعتراض وارد ہوتا تھا کہ جو زیادتی یا کمی آئین میں ایک مرتبہ پیدا ہوگی اس سے دس سال تک بچھا
 نہیں چھڑایا جا سکیگا۔ قوموں کی زندگی میں دس سال کا عرصہ چنداں طویل نہیں ہوتا اور اس تجربہ کے لئے بظاہر

یہ موزوں عرصہ تھا مگر ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی بد اعتمادی نے اس نمونہ کو موہوم نہیں رہنے دیا تھا۔ کانگریس نے اس قسم کی توجیہیں شروع کر دی تھیں کہ مسلمانوں کے لئے ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ اس سے حسن ظن رکھیں یا یہ توقع ہی رکھیں کہ آئین سازی میں وہ برابر کے شریک کا ثبوت دیں گی۔ کانگریس حلقوں سے یہ شور مٹا کہ مجلس دستور ساز آزاد مجلس ہے یہ مجلس اس حد تک تو آزاد تھی کہ اس کے فیصلوں میں کوئی بیرونی قوت مداخلت نہ کرتی یا اثر انداز نہ ہوتی لیکن ہندو اسے آزاد کہہ کر کچھ اور مفہوم لے رہے تھے وہ اسے آزاد قسرار دیکر ان قیود و شرائط سے بھی آزاد کر رہے تھے جو برطانوی سفارشات میں موجود تھیں اور جن کے سبب سے اس کی تشکیل ہوئی تھی۔

۲۵ مئی کو صدر کانگریس نے وائسرائے کو خط لکھا جس میں کانگریس مجلس عاملہ کی طرف سے کہا گیا تھا کہ مجلس دستور ساز ایسی آزاد جماعت ہے جس کا مرتب کیا ہوا آئین قطعی ہوگا۔ وہی مجلس آئین مرتب کریگی اور وہی اسے نافذ کرے گی۔

مسلم لیگ نے اس توجیہ کو قبول نہ کیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ مجلس مذکورہ کو آزاد نہیں دیکھنا چاہتی تھی بلکہ اس لئے کہ وہ اس بے آئینی کے خلاف تھی۔ سفارشات قبول کرنا اور اس کے ماتحت اس میں عائد کردہ شرائط کے ساتھ مرتب ہونے والی مجلس دستور ساز کو آزاد سمجھنا متضاد باتیں تھیں، اس نے مسلمانوں کے شکوک کو اور مستحکم کر دیا۔

مسلمانوں کے شکوک کے ازالہ کی ایک صورت یہ تھی کہ مجلس دستور ساز کے جو فیصلے اہم فرقہ دارانہ مسائل سے متعلق ہوں گے ان کے لئے دونوں فرقوں کے حاضر اور ووٹ دینے والے امکان کی علیحدہ علیحدہ اکثریت دیکر رہو گی۔ یہ تسلی بخش شرط ہوتی مگر کانگریس نے ازراہ غایت بے خودی اپنے عزائم کو کچھ اس انداز سے آشکار کیا کہ یہ خدشہ قوی ہو گیا کہ کانگریس اپنی اکثریت کا ناجائز استعمال کریگی۔ مزید برآں 'فرقہ دارانہ' ایک مبہم لفظ تھا اس کا مفہوم، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ہندوؤں کے نزدیک کچھ تھا اور مسلمانوں کے نزدیک کچھ اور۔ مثلاً بعض تجارتی کاروبار خالصتہً مسلمان کے ہاتھ میں تھے۔ تو اگر اس مخصوص تجارت پر کوئی پابندی عائد کی جاتی تو بظاہر وہ ایک اقتصادی مسئلہ ہوتا مگر درحقیقت وہ فرقہ دارانہ مسئلہ ہوتا۔ ایسے میں مسلمان

بضہ ہونے کے مسئلہ فرقہ دارانہ ہے اور ہندو اس سے انکار کرتے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون یہ فیصلہ کر سکتا تھا کہ کون سا فرقہ دارانہ ہے یا نہیں۔ اس فیصلے کا اختیار مرکزی مجلس دستور ساز کے صدر کو حاصل تھا۔ گویا صدر جس مسئلہ کو غیر فرقہ دارانہ قرار دیتا اس کی نوعیت کچھ بھی ہوتی اسے فرقہ دارانہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہ اختیار صدر کو دے کر وزارتی مشن نے مسلمانوں کی پوزیشن کمزور کر دی تھی۔ کیونکہ صدر مجلس لامحالہ ہندو ہوتا اور کوئی ہندو سوائے عبادت یا دیگر رسوم و عادات ظاہری سے متعلق امور کو فرقہ دارانہ تصور نہ کرتا۔ صدر کے اس قسم کے فیصلوں کے خلاف صرف اتنا کیا جاسکتا تھا کہ کوئی فرقہ یہ درخواست کر سکتا تھا کہ اس معاملہ میں فیڈرل کورٹ سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔ اس طریقہ میں پھر یہ شکل تھی کہ صدر پر پابندی صرف اس قدر تھی کہ وہ فیڈرل کورٹ سے مشورہ کر لے لیکن اسے کورٹ کا فیصلہ بہر حال منظور کرنے پر پابند نہیں کیا گیا۔ وہ کیسے مشورہ کرتا؟ یہ بھی غیر واضح تھا۔ گویا اس ضمن میں قطعی رائے صدر کی تھی اور یہ مسلمانوں کے لئے از حد غیر تسلی بخش تھا۔

ریاستوں کی پوزیشن یہ تھی کہ ان کے نمائندے ازراہ آئین کی تدوین کے بعد مرکزی اسمبلی میں ازراہ آئین نمائندوں کے ساتھ شریک ہوں گے اور سب مل کر لوہین کے تین شعبوں پر مشتمل دستور نامے تیار کریں گے۔ بھارتی اقتدار اعلیٰ کے خاتمہ پر ریاستوں کو بہر نوع نئے آئین میں اپنی جگہ متعین کرنا تھی۔ پہلے تو واپان ریاست انگریزی سایہ سے محرومی اور شخصی حکومت کے خاتمہ کے تصور سے بے چارے ہوئے لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کی قسمت نئے بندیں کانگریس سے وابستہ ہے کیونکہ وہی ایک ایسی سیاسی جماعت تھی جو بظاہر انگریزی جانشین بنتی نظر آتی تھی۔ کانگریس کی پروپیگنڈہ مشینری نے اس خیال کو خوب تقویت دی۔ یوں بھی واپان ریاست بشیر بندو تھے۔ انھوں نے اپنی منافیت کانگریس سے تعاون میں ہی دیکھی۔ اس تعاون کے جو فوائد نتائج نکلے اس کے تصور سے انسانیت کا پتہ ہے۔ رحمت و برکت کی یہ ہولناک داستان ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

پھر چند ریاستوں کی شرکت کا سوال ازراہ آئین کی تدوین کے بعد پیدا ہوتا تھا لیکن اکا دکا ریاستوں کی مجلس دستور ساز میں شریک ہونے کا اعلان شروع کر دیا۔ یہ حرکت غیر آئینی تھی مگر کانگریس اپنی پوزیشن کے

مہا سہ میں وزارتِ وفد کی طرف سے یہ یقین دلایا کہ دو پارٹیوں میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی اور جو پارٹی بھی سفارشات کو منظور کرے گی اس کے ساتھ مل کر حالات کے مطابق آگے بڑھا جائیگا۔ یہ ہم ضمانت تھی جو وائسرائے نے برطانوی وزارتِ وفد کی طرف سے مسلم لیگ کو دی۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر کانگریس مجوزہ سکیم کو مسترد کر دے تو برطانیہ مسلم لیگ کی مدد سے کاروبار حکومت چلائے گا تا آنکہ کانگریس آمادہ پیمانہ ہو جائے۔ یہ ضمانت نہایت اہم ہے اور اسے خصوصیت سے پیش نظر رکھنا چاہئے کیونکہ آئندہ چل کر یہ ایک نازک نزاع کی صورت اختیار کر گئی۔

دہلی میں کم ہونے کے باعث اس مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اشاعت آئندہ میں

برطانوی وفد کی عبوری دور سے متعلق تجاویز اور بعد کے آئینی مذاکرات کا ۳ جون ۱۹۴۷ء کے

اعلانِ پاکستان تک کا جائزہ لیا جائے گا۔ انشا اللہ

منفیس

کارگہ حیات کا تمام نظم و نسق سہی و عمل پر چل رہا ہے۔ اور یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ معاشی و اعمالی صحیح نتائج بھی مرتب کر رہے ہیں یا نہیں، ان کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اس کا نام محاسبہ نفس ہے جو زاہد رویہ نہیں دیکھتا کہ اس نے کس قدر مسافت طے کر لی ہے اور باقی راستہ کتنا رہ گیا ہے اسے منزل تک پہنچنے کی حتمی امید نہیں رکھنی چاہئے، اس لئے کہ جو مسکتا ہے کہ کسی دورا ہے پر وہ غلط موڑ مڑ گیا ہو اور اس کے بعد وہ ہر چند چلا جا رہا ہو لیکن اسے اس کا احساس تک بھی نہ ہو کہ اس کا ہر قدم اُسے منزل سے دور سے دور تر کرنا چلا جا رہا ہے۔ جو ملین، میقاس الحرات کی جدول مرتب نہیں کرتا وہ کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کا علاج صحیح ہو رہا ہے یا نہیں۔ جو دکانڈا کبھی اپنا ہی کھاتا نہیں ملاتا اور وقتاً فوقتاً اپنا (Stock taking) نہیں کرتا وہ کبھی نہیں محسوس کر سکتا کہ اس کی تجارت نفع مند ہے یا اُسے خسارہ کی طرف لئے جا رہی ہے۔ پھر جب انفرادی زندگی میں محاسبہ نفس یا جائزہ اعمال کی اس قدر ضرورت ہے تو ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی میں یہ ضرورت اور بھی اہم و اشد ہو جاتی ہے۔ جو قوم یہ نہیں دیکھتی کہ بساط سیاست پر اس سے کون سی چال غلط چلی گئی اُسے بازی جیتنے کی بہت کم توقع رکھنی چاہئے۔ جو اس کا اندازہ نہیں کرتی کہ فلاں دورا ہے پر اس کا قدم کس طرف اٹھ گیا وہ جہانِ مابقت و دنیائے منافست میں نامت و قیادت کی امیدوار نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ جائزہ و موازنہ اور محاسبہ و مقابلہ ہے جسے بالفاظِ دیگر تنقید کہتے ہیں۔ متاعِ زندگی کی صحیح پرکھ محک نقد و نظر پر ہی ہو سکتی ہے جو اپنی تنقید آپ کو لیتا ہے اُسے پھر کسی دوسرے کی تنقید سے ڈرنے اور جھکے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ اپنے مال کی قیمت کو خوب جانتا ہے۔ اس لئے وہ اسے دینا سے بیع و خرید کی ہر منڈی میں بلاتردد و تامل پیش

مٹی تو اس کی نہیں تھی کسی اور کی وجہ سے مٹی۔ خواہ ایسا کرنے میں اسے کتنے ہی لچر دلائل اور کسی ہی پروج
 نوجہات سے کام کیوں نہ لینا پڑے۔ حالانکہ غور سے دیکھئے تو غلطی گناہ کی بات نہیں جس سے اس قدر
 شرایا جائے۔ غلطی تو انسانی فکر و عمل کی حریت کی دلیل ہے۔ یہ تو اس کے اختیار و ارادہ کی آئینہ دار ہے
 پتھر کبھی غلطی نہیں کرتا۔ اور اسی طرح فرشتہ سے بھی غلطی کا امکان نہیں بلکہ اس لئے کہ انہیں اپنے فیصلوں
 میں کوئی اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے جس کے استعمال میں اس سے غلطی
 بھی ہو سکتی ہے۔ انہی غلطیوں سے سین حاصل کر کے قومیں آگے بڑھتی ہیں۔ تجربہ، جو نوع انسانی کے
 تمام کسب و نہز اور متاع و حاصل زندگی کی بنیاد ہے، غلطیوں سے حاصل کردہ اسباق کا مجموعہ ہے۔ ہر ما
 غلطی کوئی جرم نہیں۔ گناہ نہیں۔ البتہ غلطی پر اصرار، حماقت ہے اور جرم عظیم۔ اور یہ اصرار بجا اوقات (بلکہ
 بیشتر) اس صورت میں ہوتا ہے کہ قوم اپنے اعمال کا جائزہ نہیں لیتی اور ارضیں تنقید کی محک پر نہیں پرکھتی،
 اس لئے اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں کہاں غلطی کر گئی ہے اور اس طرح نادانستہ غلطیوں پر اصرار
 کئے جاتی ہے۔ لیکن غلطی پر اصرار یا اس کی تکرار، خواہ دانستہ ہو خواہ نادانستہ، نتائج کے اعتبار سے یکساں
 ہوتی ہے۔ سنکیا دانستہ کھائے یا نادانستہ، اس کی سمیت تو بدستور اپنا کام کر جائیگی۔ لہذا وہی شخص قوم کا
 صحیح مشفق و مہمدر ہے جو اسے اس کی غلطیوں پر متنبہ کرے اور وہی قوم سلامتی کی راہ پر چل سکتی ہے
 جو اس تنبیہ و تذہیر پر جس بجلیں ہونے کی بجائے اسے خندہ پیشانی سے قبول کرے اور ان غلطیوں کی روشنی
 میں آئندہ صحیح قدم اٹھائے۔

آئیے ہم، متذکرہ صدر مبادیات کی روشنی میں یہ دیکھیں کہ قیام پاکستان کے وقت ہم سے کیا کیا
 غلطیاں ہوئیں تاکہ ہم انہیں سامنے رکھ کر، ایسا لاکھ عمل مرتب کریں کہ آئندہ ایسی غلطیاں ہم سے سرزد
 نہ ہوں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اس تنبیہ کی ضرورت عام حالات میں بھی کم نہیں ہوتی لیکن ایک نواذید
 مملکت کے لئے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ اس میں ابھی اتنی قوت نہیں ہوتی کہ اس قسم کی
 غلطیوں کے نتائج و عواقب کا مدافعہ کر سکے۔ بڑی عمر میں انسان کچا اناج بھی ہضم کر لیتا ہے لیکن بچے کی
 کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کی ماں ثقیل غذا کھائے تو خود بچے کو سوز رخصی ہو جاتی ہے اس لئے ہمیں ق

اس باب میں اور بھی خزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ ضلکے کے ہمارے اس اقدام کو اسی جذبہ پر معمول کیا جائے
ہو اس کا محرک ہوا ہے اور جس کے تعمیری فائدہ کی طرف اور اشارہ کیا گیا ہے



ہماری دس سال کی سیاست پر نگاہ ڈالنے اور دیکھنے کہ وہ کس قدر ایک ندی کی پرسکوت روانیوں
کی طرح، ہموار اور معتدل رہی ہے۔ اس میں آتش یا جذبات کی تلاطم خیزیوں تھیں کہ جن سے اس کی
موجیں اٹھ کر خود اس ساحل کے ٹکڑے کر دیں۔ جن کی آغوش میں انہوں نے پرورش پائی ہو، اور نہ ایسا
جبر و تعطل کہ وہ جوئے رواں ایک جوہن کر رہ جائے۔ نہ اس میں کیا ولی انداز سیاست کی روباہ
بازیاں تھیں اور نہ مشرقی ہماہمیت کی چولہ تہڑیاں۔

نہ اس میں عصرِ رواں کی جاسے بیزاری نہ اس میں عہدِ کہن کے فنا و انہوں
سیاست کیا، ایک کشتی رواں تھی جو ہر موجِ کمرش سے بچتی، ہر خطرِ جان سے کتراتی، خاموشی سے سینہ
آب کو چیرتی، ایک بڑے سیس کی طرح متعین منزل کی طرف بائیں نمط بڑے چلی جا رہی تھی کہ مسافروں کو
کہیں چکھو لاکھ نہیں لگتا تھا۔ گوہ کینٹ مشن کے پاس سے گزرتے ہوئے اس میں کچھ تزلزل سامحوس
ہوا لیکن یہ جلد ہی سنبھل گئی۔ حتیٰ کہ یہ مونٹ بیٹن کی پر شور وادولوں میں پہنچ گئی جہاں پہلی مرتبہ اس کے
بادبانوں میں تھر تھراہٹ کے آثار دکھائی دیئے۔

ہیں اس حقیقت کا کشادہ نظری سے اعتراف کر لینا چاہئے کہ ہماری سیاست، ہندو، مونٹ بیٹن
کی مکائدانہ سازش کی حریف نہیں ہو سکی۔ ہم نے چرچل اور اٹلی، دیول اور بیٹھک لارنس تک کی
شاہراہ چالوں کا مقابلہ کیا، لیکن مونٹ بیٹن کا مشفقانہ نقاب بہت دینر ثابت ہوا۔ یا یوں کہئے کہ
جب تک ہماری سیاست اصولی و نظریات تک محدود رہی ہم نہایت سلامتی اور قنات سے ہر محاف
قوت کا مقابلہ کرتے رہے لیکن جب معاملہ اس کی علی تغذ کا آیا تو اس میں ہم ہات کھائے۔

مقام ہوش سے آساں گزر گیا اقبالی مقام شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ

مونٹ بیٹن، ہندو کی اس سازش کا تعمیر ایک لفظ "عملت" میں تھا۔ تقسیم ہند میں ہندو کو ایک چلی چلائی گا

(running concern) مل رہی تھی۔ ہر چیز اس کے قبضہ میں تھی۔ وہ حکومت کی سندھ پر برہان تھا۔ جو کچھ اب آئینی طور پر اس کی طرف منتقل ہونے والا تھا، عملاً پہلے ہی اس کے پاس موجود تھا۔ اسے عجلت سے گھبرانے کی کوئی وجہ ہی نہ تھی۔ اس لئے اس نے فوراً پندرہ اگست کی شرطِ غیر مؤجل کو مان لیا اس کے برعکس، مسلمانوں کو ایک نئی حکومت قائم کرنی تھی اور یہ ناممکن تھا جب تک وہ سب کچھ ان کے قبضہ میں نہ آجاتا جو ان کے حصہ میں آنا تھا اور جو اس وقت تک عملاً ہندو کے قبضہ میں تھا اس لئے ان کے حق میں اس قدر تعجیل، مرگِ مفاجات تھی۔

ہاری پہلی غلطی یہ تھی کہ ہم نے اس تعجیلی کارروائی پر صا د کیا۔ اس کے بعد جس انداز سے مونٹ بیٹن نے کمپریٹرز ایٹھ اور گراڈ ایٹھ پیدا کی ہے اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس مدتِ قلیل میں مسلمانوں کو اس قدر جو اس کر دینا چاہتا تھا کہ تقسیم کے متعلق ان سے کچھ بن ہی نہ پڑے اور انھیں محض کاغذی ڈگری لے کر اپنے علاقہ کی طرف منتقل ہو جانا چاہے ہم اس فریب کا شکار ہو گئے۔ اس کے بعد کے تمام نتائج اسی کے نال و حواقب تھے۔ جب ہم علیحدگی کا اصول مان چکے تھے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کی عملی تنفیذ میں اس قدر جو اس کم کر دینے والی عجلت سے کام لیا جاتا۔ یہ سب کچھ آہستہ آہستہ ہوتا رہتا اور جون ۱۹۴۷ء تک مکمل ہو جاتا۔ میدانِ مبارزت میں دشمن کی سب سے بڑی چال یہ ہوتی ہے کہ فریقِ مقابل کے اوسانِ خطا کر دیئے جائیں جن نگاہوں نے گذشتہ جون جولائی (۱۹۴۷ء) کا منظر دیکھا ہے وہ اس پر شاہد ہیں کہ ہمارے اربابِ نظم و نسق کس قدر افراتفری میں تھے اور پندرہ اگست کی تاریخ ان کے پیچھے اس طرح پڑی تھی جس طرح دریا کے کنارے بسنے والوں سے جب کہدیا جائے کہ شام کو سیلاب آئیگا تو وہ سب کچھ چھوڑ چھلا، جو اس یا ختم، سرا سیمہ و ہوش گم کردہ، کچی پکی سمیٹ کر اٹھ بھاگتے ہیں اور اس سرا سگی اور جو اس باخشی میں جو کچھ وہ پیٹھ پر لاد سکیں اسے غنیمت سمجھ کر جان بچا کر وقتِ معین سے پہلے چل نکلتے ہیں۔ یہ سیلاب کا چھلا وہ مونٹ بیٹن کی فکر فوسوں ساز کی اختراع تھا جس میں وہ بڑا کامیاب رہا۔

ہم نے ایک جہاگاہ نہ حکومت تو قائم کر لی لیکن اس کا کچھ فیصلہ ہی نہ کیا کہ اس حکومت کی حدود و ثغور کیا ہوں گی۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے انگریز پر بھروسہ کیا اور اس نے ہم سے بدعہدی کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انگریز اس قدر قابل اعتماد تھا ہی کب جو اس پر اس درجہ بھروسہ کیا جاتا اور پھر وہ بھی اس حد تک کہ اس کے فیصلے کے رد و قبول کے حق سے بھی اپنے آپ کو محروم کر لیا جاتا؟ حدود کا مسئلہ کوئی جزئی یا فرعی مسئلہ نہ تھا وہ بنیادی اور اصولی مسئلہ تھا۔ ہمارا مطالبہ یہ کبھی نہ تھا کہ ہندوستان کے جتنے گوشے میں ہندو یا انگریز چاہے ہیں علیحدہ حکومت کا حق دیدیے۔ ہمارا مطالبہ شروع ہی سے یہ تھا کہ جن علاقوں میں ہم اکثریت میں ہیں انہیں ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ ان علاقوں کی تعیین کے متعلق یا تو وہ ہمارا اصول تسلیم کرنے اور اور اگر وہ اس پر رضامند نہ تھے تو پھر کھلے بندوں اس کا فیصلہ ہوتا۔ بہر حال کسی صورت میں فیصلہ ہوتا، یہ فیصلہ تقسیم سے پہلے ہونا چاہئے تھا تاکہ مشکوک یا متنازعہ فیہ علاقے کے مسلمانوں کو علم ہوتا کہ ان کا مستقبل کن سے وابستہ داماں ہے۔ کس قدر قیامت تھی کہ گورداسپور، جالندھر، فیروز پور وغیرہ کے مسلمان حصول آزادی پر حشمرت منار ہے تھے کہ ان پر مرگ ناگہانی کی طرح یہ بجلی آسمان سے آگری کہ وہ انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندو قوم کی غلامی کے شکنجے میں جکڑ دیئے گئے ہیں۔ یہ فیصلہ اس قدر ناگہانی اور غیر متوقع تھا کہ وہ نفسیاتی طور پر اسے قبول کرنے کے لئے آمادہ ہی نہیں تھے۔ ہم پر جس قدر قیامتیں بعد میں ٹوٹی ہیں ان کا ایک بنیادی سبب بلا تعیین حدود پاکستان کا قیام تھا۔

✽

ہماری تیسری بنیادی غلطی یہ تھی کہ ہم نے افواج و عسکر اور سامان و آلات حرب و ضرب کی تقسیم کے بغیر جہاگاہ سلطنت قائم کر لی۔ یوں تو شروع ہی سے اصولی جہان بینی اسی انداز کا چلا آ رہا ہے کہ حکومت کی بنیاد و اساس قوت پر ہوتی ہے۔ لیکن اس زمانہ میں اس مسئلہ نے اور بھی اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ ہر جنگ کے بعد سب سے پہلا سوال یہ پیش ہوتا ہے کہ مختلف اقوام کے پاس کس کس تناسب سے جوش و عسکر اور سامان جنگ ہونا چاہئے۔ اس کے بعد ہر قوم کی نگلہ احتساب دوسری اقوام کی عسکری قوتوں پر ہوتی ہے۔ جو قوم اس باب میں ذرا چوک جاتی ہے فوراً دلچلی جاتی ہے

ہندوستان کے اندر چھوٹی چھوٹی ریاستیں، جنہیں کبھی تو خود اختیاری حاصل نہیں ہوا تھا وہ بھی کچھ نہ کچھ فوجی قوت رکھتی ہیں۔ لیکن ہم نے کرۂ ارض پر پانچویں بڑی سلطنت قائم کی اور اپنی عسکری قوت، فریق مخالف کے قبضہ میں چھوڑ دی۔ ہندو کو معلوم تھا کہ پاکستان کے پاس اپنی حدود کی محافظت کے لئے بھی کافی سامان اور قوت نہیں ہے۔ اس لئے وہ بات بات پر ہمارے سامنے آستین پڑھا تا تھا۔ ہماری یہی بنیادی کمزوری تھی جس کی وجہ سے ہمیں اس قدر بلی نقصان اٹھانا پڑا۔ اور یہ بھی درحقیقت اسی عجلت کا نتیجہ تھا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

سامان حرب ہی نہیں ہم تو اپنا نقد روپیہ بھی انہی کے ہاں چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ اس روپے کی بازیابی میں ہمیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ نگاہ ہر میں۔ بننے سے پیسہ لینا آسان کام نہیں۔ اس کی تجوری میں اپنا پیسہ رکھنا ہی غلط تھا اور اس سے بروقت وصول نہ کر لینا غلط تر!



ان اساسی اسقام و تسامح کو چھوڑ کر اب نظم و نسق حکومت کی طرف آئیے۔ ارباب حکومت میں اوپر وہ طبقہ تھا جو عبوری حکومت کے زمانہ میں ماسیذاقتدار پر متکین کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ انہیں نظم و نسق حکومت کا چندان تجربہ نہ تھا۔ انگریزوں کے رواں نظام میں صورت یہ تھی کہ جس کسی کو جہاں بٹھادیکھے وہ کام چلا لیتا تھا۔ لیکن خود اپنا نظام متعین کر کے اسے رواں کرنا تو ہر ایک کا کام نہ تھا۔ تقسیم کے زمانہ میں ہماری اس نا تجربہ کاری نے ہمیں سخت نقصان پہنچایا۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو پہلے سے ملازمتوں میں چلا آ رہا تھا۔ انہیں نسبتاً تجربہ حاصل تھا لیکن ان کے لئے ایک اور وقت تھی۔ انگریز کی مشینری میں مسلمان ملازمین مختلف پوزیوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ کوئی یہاں، کوئی وہاں، ایک تو تعداد میں کم دوسرے ہندو کی گہری حکمت عملی کے ماتحت، ایسے مقامات پر نصب شدہ، جہاں انہیں حکومت کے حقیقی نظم و نسق میں چندان اہم حیثیت حاصل نہ تھی۔ تقسیم کے وقت ہی پوزے ادھر ادھر سے نکل کر کجا کر دیئے گئے۔ پہلی مشینری کے اندر تو یہ اپنے اپنے نرائض مفروضہ کی سرانجام دہی کر سکتے تھے لیکن از خود ایک مکمل مشینری تو نہیں بن سکتے تھے۔ لیکن ہندی مشینری انہی کے مجموعہ کا نام تھی

ایک توشنری ایسی ناممکن ہے اس سے اس برق رفتاری سے کام کرنا پڑا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ چنانچہ اس باب میں ایسے ایسے نقائص و استقامتوں سے جن کا حیا زہ اس وقت تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔

سب سے پہلا سوال یہ مانتے آہم ہے کہ ملازمین میں سے کس کس کو پاکستان لے جایا جائے اس کا سبب ترین اور اطمینان بخش جواب یہ تھا کہ جس جس کی ضرورت ہو اسے لے جایا جائے۔ لیکن اس کیلئے پہلی ضروریات کا متعین کرنا ضروری تھا۔ اس کے لئے فرصت، محنت اور اہلیت درکار تھی۔ فرصت تو واقعی کم تھی لیکن بایں ہمہ اگر اسی تناسب سے محنت زیادہ کر لی جاتی تو ہمارا خیال ہے کہ یہ کچھ ایسا ناممکن مرحلہ نہ تھا لیکن ایسا نہ کیا گیا اور اس کی آسان صورت یہ سمجھی گئی کہ اعلان کر دیا جائے کہ ملائے عام ہے یا ران نکتہ داں کے لئے

ہر شخص جو پاکستان جانا چاہے چلا جائے۔ جنگ کے زمانہ میں دفتری ضروریات بہت بڑھ گئی تھیں ان کیلئے عملہ بھی بے شمار رکھنا پڑا تھا۔ جنگ کے بعد خود حکومت ہند کو بھی اس حجم غنیمت کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ انہیں تخفیف میں لانے کی فکر میں تھی۔ پھر زیادہ جنگ میں عملہ کے لئے معیار انتخاب بھی ایسا ہی تھا۔ اس پستی معیار سے پیدا شدہ استعداد کی کمی کو تعداد کی زیادتی سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان عارضی ملازمین کی تخفیف ضروری تھی اور انہیں ملازم بھی اسی شرط پر رکھا گیا تھا۔ اب جو انہوں نے باپ پاکستان کو اس طرح کھلا دیا، تو ہر شخص اس میں داخل ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ عملاً ضرورت سے کہیں زیادہ ہو گیا اور استعداد کے اعتبار سے معیار سے کہیں نیچے۔ یہ ہجوم وانبوہ اس طرح جانب پاکستان روانہ ہوا جیسے تماشائی کہیں میز دیکھنے جا رہے ہوں۔ یہاں پہنچے تو دفتر کے لئے جگہ نہیں، رہنے کے لئے مکان نہیں، بیٹھنے کے لئے میز کرسی نہیں، لکھنے کے لئے کاغذ یا قلم دوات نہیں۔ حسب سابق کام کرنے کیلئے پچھلا ریکارڈ نہیں۔ از خود کام کرنے کے لئے پوری مشینری نہیں اور اگر مشینری ہے تو ذہنوں میں جدت افکار نہیں دلوں میں ولولہ کار نہیں۔ عام حالات میں بھی، فوٹے بدراہانہ بسیار اور اب تو یہاں بھی بنے بنائے سامنے رکھے تھے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ بیکار دلغ شیطان کی کلاگہ بن جاتا ہے، بالکل درست ہے۔ ان بیکار دماغوں نے اس اس قسم کے مظاہرے کئے جن کی یاد سے رعب شراب جاتی ہے۔ ہر شخص کو یہ فکر، جو لاہے

کی نال بنائے ہوئے تھی کہ اس تنظیم نو میں مجھے کیا ملتا ہے! میں معلوم ہوتا تھا گویا پاکستان، مال غنیمت کا انبار ہے جس کے حصے بخرے ہو رہے ہیں اور ہر شخص کو اپنے اپنے حصے کی فکر ستا رہی ہے۔ ایک لاش ہے جس پر چاروں طرف سے گبرہ منڈلا رہے ہیں۔ ذہنوں میں نقشے بنتے ہیں تو اسی کے لئے۔ دعا غوں میں ایکسین تیار ہوتی ہیں تو اسی کی خاطر دن بھر دوڑ دھوپ ہو رہی ہے تو اسی مقصد کے پیش نظر ہاتھ کی تیری توڑے کی میری۔ ایک عجیب افراتفری اور نفسانفی کا عالم ہے۔ وہ یہ بن گیا۔ مجھے یہ کچھ بنا چاہئے۔ اس تک و تا میں بہتوں کی بن آئی۔ ان کے لئے پاکستان کیا بنا ڈیڑی کی لٹری نکل آئی۔ جو وہاں کسی قطار شمار میں نہ تھے، پہلے سب سے معتبر بن گئے۔ حکومت کی مشینری چلے، نہ چلے، ان کی بلانے سے۔ انھیں تو مناصب بلند اور مدارج رفیع الشان حاصل ہو گئے۔ وذلک الفوز العظیم۔

حق انتخاب کو استعمال کر کے پاکستان آئیو لے طبقہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ جو مرکزی حکومت کے دفاتر (دہلی) میں ملازم تھا اور دوسرا وہ جو ہندوستان کے اطراف و جانب میں پھیلا ہوا تھا (مثلاً پیرے اور ڈاکھانے وغیرہ کے ملازمین) اول الذکر طبقہ کراچی پہنچ گیا۔ جو حکومت پاکستان کا صدر مقام قرار پایا تھا۔ اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بیشتر اسی عمل سے متعلق ہے۔ ثانی الذکر بے چارے عجیب پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ (ادرا بھی تک ہے) ذرا غور کیجئے کہ لاکھوں کی تعداد میں عملہ اور اس کے متعلقین، ملک کے دور دراز گوشوں میں کھرا پڑا ہے۔ حق انتخاب کے بعد وہاں کی حکومت نے انھیں برطرف کر دیا حالانکہ معاہدہ کی رو سے انھیں بتدریج منتقل کیا جانا تھا، اب وہ ان کی نگاہوں میں یکسر دشمن بن گئے۔ لہذا وہاں رکنا ناممکن۔ حکومت پاکستان کی نظر سے ان کی تعیناتی کے متعلق کوئی احکام نہیں پہنچے لہذا وہ جائیں تو کدھر جائیں۔ اور اگر احکام بھی پہنچ گئے ہوں تو پاکستان کس طرح آئیں۔ ملک غیروں کا۔ وسائل کمزور ت سب ان کے قبضے میں۔ ان کے ساتھ ان کا روئے یکسر معاندانہ۔ اب ان غریبوں کو کچھ معلوم نہیں کہ کریں تو کیا کریں۔ بیچارے بال بچوں کو ساتھ لئے مارے مارے پھر رہے ہیں لیکن کہیں گوشہ عافیت نہیں۔ کوئی مامن و مسکن نہیں، کچھ راستوں میں مارے گئے۔ کچھ پناہ گزینوں کے کیمپ میں تباہ ہو گئے۔ جو نہ ہلکا مشکلات و صعوبات کے بعد پاکستان پہنچ گئے ان کے لئے رہنے کو مکان نہیں، خرچ کے لئے پیسے نہیں، کرنے کے لئے کام نہیں۔ عجیب پریشانی اور بے سرو سامانی ہے۔ حکومت انھیں

تختِ اہلس دے یا پناہ گزینوں کے زمرہ میں شامل کر کے ان کی ضروریات کی کنٹینل بنے۔ اخراجات کا بار بہر حال اٹھانا ہے۔ چھ مہینے ہو گئے فالو اترا جات کے اس بوجھ سے حکومت کی کمر ٹوٹ رہی ہے اور عملہ اور اس کے متعلقین پر لٹائیوں اور مصیبتوں کے ہاتھوں الگ تباہ ہو رہے ہیں اور یہ سب اس لئے کہ آنے سے پہلے یہ سوچ لیا گیا کہ ضرورت کے مطابق عملہ ساتھ لانا چاہئے۔ اور پھر یہاں پہنچنے کے بعد اس وقت تک یہ فیصلہ کیا جاسکا کہ اب جو انھیں اس طرح یہاں لایا گیا ہے تو انھیں سنبھالا کس طرح سے جائے!

کہا جاسکتا ہے کہ اگر اس تمام عملہ کو ساتھ نہ لایا جاتا تو بھی یہ پناہ گزینوں کی حیثیت سے یہاں آجاتا۔ جیسا کہ وہ تمام عملہ یہاں آ گیا جنھیں جی انتخاب نہیں دیا گیا تھا۔ لیکن بادی التعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اس فاضل عملہ میں جسے جی انتخاب دیکر ساتھ لایا گیا ہے اور اس عملہ میں جو پناہ گزینوں کی صورت میں آیا ہے زمین آسمان کا فرق ہے۔ اول الذکر عملہ تمام مراعات بطور استحقاق مانگتا ہے اور اگر ان میں کسی قسم کی کمی کا سوال پیش ہوتا ہے تو انھیں دکھانے لگتا ہے۔ ثانی الذکر احساناً امداد کی درخواست کرتا ہے اور اسے جو کچھ مل جائے اسے غنیمت سمجھتا ہے۔ لہذا کام بھی اچھا کرتا ہے اور مطمئن بھی ہو جاتا ہے۔ اس احساسِ استحقاق نے عملہ میں عجیب کیفیت پیدا کر رکھی ہے، ان میں سے اکثر و بیشتر عارضی ملازمین تھے جنھیں جنگ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے ماتحت ملازم رکھ لیا گیا تھا۔ ان کی ملازمتیں کبھی عارضی تھیں اور شرط و بائیں شرط کہ حکومت جب چاہے گی ایک ماہ کا نوٹس دے کر انھیں برطرف کر دے گی۔ انھیں شرائط کو برقرار رکھتے ہوئے انھیں پاکستان لایا گیا لیکن پاکستان پہنچنے کے بعد ان کی یہ کیفیت ہو گئی کہ گویا انھوں نے پاکستان کی ہفت پُشت ہنٹا دنسل پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ بات بات پر روٹھ رہے ہیں۔ بدمذہب کر کے نہیں دیتے اور ہر وقت دھونس جانے کی فکر دامن گیر رہتی ہے سرکشی اور ضوابط شکنی کا نام ان کے نزدیک آزادی ہے۔ چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ کام کا معیار اس قدر گر گیا ہے کہ شاہِ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے زمانہ میں بھی ایسی صورت نہ پیدا ہوئی ہوگی۔ سست رفتاری کا یہ عالم ہے کہ اصحابِ کھف کی طرح تحسبہ بھدایقا ظاً و ہدھر قود (تو انھیں جاگتا ہوا سمجھتا ہے حالانکہ وہ سو رہے ہیں) پاکستانِ عظیم میں سے گذر رہا ہے لیکن ان کی یہ حالت ہے کہ

ہوئی لاکھ دنیا ادھر کی ادھر ہے وہی سنگِ درہے وہی اپنا سر ہے

ان میں یقیناً ایسا عملہ بھی ہے جن کا یہ اعتراض درست ہے کہ ہمیں حق انتخاب دے کر پاکستان لایا کیوں گیا۔ ہم وہاں رہتے تو جو کچھ ہم پر گذرتی ہم جھیل لیتے۔ یہاں لانے کے بعد اب ہم سے اس طرح کا سلوک کیا جا رہا ہے۔ غرضیکہ ایک طرف حکومت اس فاضلہ علی کی وجہ سے نظم و نسق کی ابتری اور اخراجات کی زیادتی کی مصیبتوں میں مبتلا ہے اور دوسری طرف عملہ، شکوہ سنج ہے کہ "بارغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں؟ اس پریشانی میں جہاں ایک طرف ہزار ہا عملہ کو مفت کی تنخواہیں دی جا رہی ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں ان کے جائز اور واجب مطالبات بھی نہیں دیئے جاتے۔ ایسی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ لوگ باقاعدہ کام کر رہے ہیں لیکن چھ ماہ سے انہیں تنخواہیں نہیں ملیں۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ فاضلہ علی خود اور ان کے بعض ہی خواہ بھی یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اس عملہ کو فالتو قرار دے کر نکال دیا جائے۔ بسوخت عقل زحیرت کہ اس چہرہ بولالعمی امت۔ یہ جذبہ محدود اور ذاتی اغراض کا آئینہ دار ہے اور بس۔ عملہ متعلقہ کے نزدیک حکومت پاکستان کی "افادیت" کا دار و مدار اس سوال کے جواب پر ہے کہ "مجھے کیا ملتا ہے؟ یعنی مملکت پاکستان کے حصول پر جس شخص کو کوئی منصب بلند مل گیا، یا اس کے لئے کوئی اخذ ذاتی منفعت کی صورت نکل آئی تو پھر تو اس کے نزدیک پاکستان بجا اور درست اور اس کا قیام مفید و پر منافع۔ اور جس شخص کو اس "لوٹ کھوٹ" سے کچھ حصہ نہیں ملا اور وہ اسی حال پر رہا جس پر قیام پاکستان سے پیشتر تھا یا اس ہنگام میں اسے ذاتی نقصان (لفظ ذاتی) کو خصوصیت سے نگاہ میں رکھے یہی ہماری تنقید کی اساس بن گئی ہے اور یہی ہمارے ملی امراض کی علت العلل ہے) اٹھانا پڑا تو اس کے نزدیک پاکستان مذموم و مردود۔ فاضلہ علی کیوں بدستور سرکاری ملازمت سے چپکا رہنا چاہتا ہے؟ آپ اس سوال کے جواب کی سنجیدہ تلاش کیجئے گا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کتنی خطرناک بیماری کی علامت ہے۔ یہ وہی دیرینہ بیماری ہے جس کے اب تک ہم شکار چلے آئے ہیں۔ یہ ذہنیت ہمیں ورثہ میں ملی ہے اور ہماری تربیت کا جزو غالب یہی ہے کہ سرکاری ملازمت آبرو مندانه ذریعہ معاش ہے اور اس کے علاوہ دیگر صنعتی اور تجارتی ذرائع معاش عزت بخش نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اب حکومت ہماری اپنی ہے لہذا ہم پر اس کی خدمت فرض ہے۔ لیکن غور سے دیکھیے کہ خدمت حکومت کا صرف ایک ہی ذریعہ تو نہیں۔ اس کے متفرق ذرائع ہیں۔

پس ساری قوت اسی ایک نماز پر ہی کیوں ممتنع کر رہے ہیں! اس طرح آپ دوسرے ہم عقائد کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ آپ ضرورت قومی کا بہ حیثیت کل مطالعہ کیجئے اور اس کو تاہ نظری کو ترک کیجئے۔

یہ اس دور غلامی کی ذہنیت ہے جب ہمارے آقاؤں کو اپنی ضرورت کے لئے ہمیں تیار کرنا مقصود تھا لیکن وائے بدبختی ہم ملازمت کے کٹھوں میں ایسے جتے جتے کہ اقتصادیات کی لامحدود فضاؤں میں تلاشِ رزق کرنے کیلئے اس چکر سے نکل ہی نہیں سکے۔ اپنے آپ کو سرکاری ملازمتوں تک محدود کر دینے کے نتائج ہم برسوں سے بھگت رہے ہیں۔ لیکن تقسیم نے ان نتائج کو اور بے پناہ اور اشد بنا دیا ہے۔ غیر مسلم تاجروں کے ترک پاکستان پر ہمارے تجارتی و صنعتی ادارے بیکار پڑے ہیں۔ ان کے چلانے کیلئے نہ مطلوبہ تجربہ میرے نہ اہلیت۔ اس نقل مکانی سے تجارت میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے ہمیں فی الفور پُر کرنا چاہئے۔ جب تک یہ خلا باقی ہے ہمسلا نظام حکومت و معاشرت مکمل نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے آسمان سے فرشتے نہیں اتریں گے بلکہ خود مسلمانان پاکستان کو شبانہ روز محنت سے ان ماحول پر چلنا ہوگا جن سے وہ اب تک دور رہے ہیں۔ انھیں ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہوگا جنھیں ابھی تک غلامی نے خوابیدہ رکھا اور جو وہ ہائے محن و مصائب کھو کھو کر کامرانوں کی جوئے شیر ہواؤنے کی ضامن ہیں۔ لیکن اس وقت ہم اس غیر معمولی محنت و گھبراہٹ میں ہیں۔ ہم اس اجنبیت سے خائف ہیں جو ان غیر مانوس ماحول پر چلنے سے ہمیں محسوس ہوگی۔ الغرض ہم مملکتِ زندگی کا گلابائے رکھنا چاہتے ہیں۔ زندگی کا جو فرارہ آزاد اقوام کے اعماقِ قلب سے پھوٹتا ہے ہم اس کے شمع کو بند کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انہی آسان، پامال ماحول پر چلنے پر مصر ہیں جن کی ہمیں عادت ہو گئی ہے۔ یہ ہے اصل جذبہ محرکہ اس مطالبہ کا کہ فاترِ عملہ کو ملازمتوں سے الگ نہ کیا جائے۔ لیکن ذرا اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ حکومت پاکستان کوئی بیرونی ادارہ نہیں، وہ ہماری اپنی حکومت ہے۔ میری، آپ کی، خدارا حکومت کو مغیر نہ سمجھئے۔ یہ خارجی ادارہ نہیں۔ یہ آپ کا قائم کردہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو اس کی ترکیب اور فعالیت پر شدید اعتراضات ہیں۔ لیکن صحیح راہِ عمل اس کی تخریب نہیں، بلکہ اس کی اصلاح ہے۔ آپ اس پر جو ناجائز بار ڈالیں گے اس سے آپ کی کمر ٹوٹے گی۔ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر باسندہ مملکت کے لئے "حیث و حکم" (قیام و نظام) کا انتظام کرے۔ یہ دعوت، لیکن اس کو ثابت نہیں ہوتا کہ

حکومت ایک متمیم (ریکارڈ) خاد یا انجمن بیکاراں کی منضم بن جائے اور ارکان انجمن کے وظیفے مقرر کر دے۔ اس سے فاضلہ علی کی عدم تخفیف کا جواز نہیں نکلتا۔ یہ ایک عمری مسئلہ بن جاتا ہے۔ مناسب و صحیح الفاظ میں قوم کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ اس قومی اتحاد نے ہزاروں لاکھوں افراد قوم کو جس بے رحمی سے پامال کیا ہے انہیں پھر سے کیسے اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جائے۔ قوم (شمول حکومت) یہ مسئلہ پوری ذمہ داری اور کمال تدبیر سے حل کرنا چاہئے۔ قوم میں جتنے بیکار لوگ ہیں انہیں جہاں تک ممکن ہو موجودہ اداروں میں کھپانا چاہئے۔ اگر موجودہ ادارے کافی نہ ہوں تو نئے مسائل معاش تلاش کرنے چاہئیں۔ قیام پاکستان نے قوم کے سامنے متعدد ذمئی راہیں کھول دی ہیں۔ مٹران کاراجی صلاحیتوں کا جائزہ لے کر اور اپنے میلانات وغیرہ کا پاس کر کے ان راہوں پر گامزن ہونا ہے۔ منتظرین فردا، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ ان میں عمل کے آثار ہیں تو صرف یہ کہ حکومت نااہل ہے، ظالم گردن زدنی ہے۔ ومن ذالک الہفوات۔

ہم حکومت کی وکالت نہیں کر رہے۔ اس کے عدم تدبیر اور فقدان مال اندیشی کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے لیکن جمہوری آئین کے مطابق جس پر کاربند ہونے کا ہم بعد حکومت دعویٰ کرتے ہیں۔ کوئی حکومت ناقابل تبدیل نہیں ہوتی۔ آپ آئینی طور پر اپنی قوتیں جمع کر کے نااہل و ناقابل برداشت حکومت کو بدل سکتے ہیں اور اس کے بجائے فریضہ حکومت بہتر افراد قوم کے سپرد کر سکتے ہیں۔ آپ موجودہ حکومت سے مطمئن نہیں تو آئینی جدوجہد سے اس کی اصلاح (یا تبدیلی) کے لئے کوشش کیجئے۔ لیکن خدا کے لئے اس کی حقیقی یا موہوم غایب کو مبالغہ آمیزی سے پیش کر کے اپنی خامیوں کو نظر انداز کر دینے کی خود فریبی سے بچئے۔ یہ صریح فریب نفس ہے۔ آپ اس حقیقت کو کبھی نہ سمجھو گے کہ اجمعی بالائی صرف اچھے دودھ پر آسکتی ہے۔ نااہل حکومت نااہل قوم کی تخلیق ہوتی ہے۔ موجودہ حکومت قوم کا عکس ہے۔ ایک کی نااہلیت دوسرے کی نااہلیت کی مستلزم ہے۔

ان حالات میں حکومت سے یہ مطالبہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضروری مراعات دے۔ جو صنعت و حرفت کی طرف توجہ دینے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ہم جس بے روزگاری کے خوف سے ہسے ہوئے ہیں اور جوں جوں پھیل رہی ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ فرسودہ اور روایتی راہوں کو چھوڑ کر نئی نئی نفاذ میں پُرفشانی کی جائے تاکہ ملک اور قوم دونوں کا بھلا ہو۔

اس صلح عام سے صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ ضرورت سے زیادہ عملہ ساتھ آگیا بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ایک اور خرابی بھی پیدا ہو گئی۔ اود یہ خرابی ایسی ہے جو پاکستان کے پورے کے پورے نظام کی تخریب کا موجب بن سکتی ہے۔ نازد از ضرورت عملہ سے تو اقتصادی نقصان ہی پہنچا لیکن اس دوسری خرابی کے نتائج ایسے دور رس اور نازک بن سکتے ہیں کہ اگر اس کا کچھ قرار واقعی مدافعت نہ کیا گیا تو حکومت پاکستان کا قصر نو تعمیر بنیادوں سے بل جائیگا۔

حکومت ہند میں اکثر مسلمان ایسے تھے جو عمر بھر تحریک پاکستان کے مخالف اور مسلم لیگ کے دشمن رہے۔ یہ قومیت پرست گروہ تمام دہہ تریس میں پاکستان اور لیگ کے خلاف منافرت کا زہر پھیلاتا رہا تھا اور اپنے آقا یا ان نعمت (ہندوؤں) کی قومیت کے گھنڈے پر مسلمانوں کے محبوب ترین قائدین کو ہدفِ طعن و تشنیع تک بنانے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ سننے ہیں کہ وہاں ایسے مناظر اکثر سامنے آجاتے تھے کہ ایک ہندو نے مسلم لیگ اور اس کے داعیات و مطالبات کے خلاف سلسلہ جنابانی کی اور اس کے بعد انیشنلسٹ مسلمانوں ہی سے ایک نئے یہ سررشتہ اپنے ہاتھ میں تمام لیا۔ اس پر وہ ہندو تو خاموش ہو گیا اور ان حضرات نے مسلمانوں کے خلاف ایسا زہر اگلنا شروع کر دیا جس کی جہارت خود ہندو بھی نہ کرتا۔ اور اگر اس کے جواب میں کوئی لگی مسلمان کچھ کہنا چاہتا تو ہندوؤں کی طرف سے (جو اکثر بالادست ہوتے تھے) یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا جاتا کہ دفتر میں پائینکس کے متعلق بحث و تمحیص نہیں ہونی چاہئے۔ یہ نیشنلسٹ مسلمان، اپنے ہم مشرب اکابرین (مثلاً ابوالکلام صاحب آزاد وغیرہ) سے اکثر روابط قائم رکھتے اور انہی کے ایما سے کانگریس کی پراپیگنڈا ایجنسی کی حیثیت سے کام کیا کرتے۔ مسلمان ان آستین کے سانبوں کے ہاتھوں سخت نالاں تھے۔ حصول پاکستان کے بعد یہ امکان نظر آتا تھا کہ اب قوم، ان عقدا ران ملت کی رو باہ بازوؤں سے، مخلصی حاصل کر لیگی۔ لیکن اس صلح عام سے یہ ہوا کہ تمام قومیت پرست عنصر پاکستان آ پہنچا اور دفا تر میں مختلف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اب سننے یہ ہیں کہ یہی "رکنِ پنجم" (Fifth Column) حکومت پاکستان کی مشینری میں معتبر اور مستند علی بنے ہوئے ہیں اور چونکہ ان پاکستانی ملازموں کو پہلے سے اس امر کی ضمانت دیدی گئی تھی کہ ان کے جملہ حقوق ملازمت محفوظ رہیں گے اس لئے یہ گروہ منافقین، خنجر دار تین، اپنی زہر افشانیوں میں بدستور مصروف ہے۔ ہم تو اس قہجر پر پہنچے ہیں کہ یہاں بدعتزانیوں اور سرکشیوں کے جو مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر اسی

گروہ کی انگلیخت کا نتیجہ ہوں گے۔ پیگروہ اپنے ساتھ ایک خاص مقصد لے کر آیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہر وقت مصروف کا رہتا ہے۔ کبھی ناہمین مشفق کے لباس میں اور کبھی ناقدرین مصلح کے نقاب میں، یہ لوگوں کے حوصلوں (Morale) کو پست کرنے اور ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر انھیں پاکستان اور اس کے اربابِ حل و عقد کے خلاف و بھلانے اور بھڑکانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ دنیا میں ہر ملازم رکھنے والے کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ صرف اس شخص کو ملازم رکھے جس پر اسے پورا پورا اعتماد ہو اور جو اس کے کاروبار اور نظم و نسق کو نقصان پہنچانے کا موجب نہ ہو۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق تمام حکومتیں، صرف ان لوگوں کو شریک کار بناتی ہیں جن کے احوال و جواذب اور میلانات و عواطف کی انھوں نے چھان بین کر لی ہوتی ہے لیکن یہاں یہ ہوا ہے کہ وہ لوگ جن کے متعلق برسوں کے عینی مشاہدہ نے بتا رکھا تھا کہ یہ پاکستان کے بپے دشمن ہیں ان سب کو بلا تخصیص شامل دفاتر حکومت کر لیا گیا ہے اور یہیں معلوم ہوا ہے کہ نہایت ذمہ داری کے کام ان کے سپرد ہیں اور چونکہ ان کے حقوق ملازمت کے تحفظ کی بھی ضمانت دیدی گئی ہے اس لئے وہ بے خوف و خطر اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف رہ سکتے ہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ نیک نیتی سے نیشنلزم (پاکستان کے خلاف) عقیدہ رکھتے ہیں اور حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان کے عقیدہ کی آزادی کو سلب کر لے۔ بجا اور درستہ! لیکن یہ تو فریضے کہ اگر اس قسم کے سیاسی عقائد کا اختلاف ایسا ہی معصوم ہے تو گزشتہ دس برس کی سیاسی جدوجہد میں آپ و نیشنلسٹ مسلمانوں کو ملت کے بدترین دشمن کیوں قرار دیا کرتے تھے؟ وہ نہایت نیک نیتی سے ایسا عقیدہ رکھتے تھے لیکن بایں ہمہ آپ نے انھیں کبھی اس بنا پر ہی خواہ ملت قرار نہیں دیا کہ ان کا عقیدہ نیک نیتی پر مبنی ہے۔ سو اگر یہ لوگ باوصف نیک نیتی، دشمنان ملت قرار دیئے جاتے تھے تو دفاتر میں ہی لوگ کس طرح ہی خواہان قوم ثابت ہوں گے! از اسوجے کہ اگر آج ابوالکلام صاحب آزاد اپنے موجودہ عقائد کو برقرار رکھتے ہوئے چاہیں کہ آپ کی وزارت میں شریک ہو جائیں تو کیا آپ اس کی اجازت دیں گے؟ شریک حکم کرنا تو ایک طرف، آپ تو اختلاف عقیدہ سیاسی کی بنا پر اسے مسلم لیگ کا دہ آئین کا ممبر ہی نہیں بنائیں گے، اور یہ بالکل بجا اور درست ہے۔ اور پھر اختلاف کی نوعیت پر ہی تو غور کیجئے۔ آپ نے پاکستان کی سلطنت اس

بنامہ پر قائم کی ہے کہ آپ کے نزدیک مسلمانوں کے لئے جداگانہ حکومت کا قیام نہایت ضروری ہے اور یہ لوگ نہایت نیک نیتی سے عقیدہ رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ قومیت کا تصور اور علیحدہ حکومت کا قیام نہایت ناجائز اور سیاسی طور پر سخت تباہ کن ہے۔ کہئے کہ اس قسم کے عناصر کو حکومت کی مشینری کے اجزا بنانا خود کئی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ ہے وہ تباہ کن خرابی جو اس مصلائے عام سے پیدا ہوئی۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے عام آزماؤں اور ضرورت عملہ کا نقصان عارضی ہے اور اس کا دائرہ لغو و اقتصادی۔ لیکن ان مارہائے آستین کی بددش اور نظام حکومت میں ان کا عمل دخل، ایک مستقل خطہ ہے اور اس کے نتائج و عواقب ہمہ گیر۔ اگر عام آزماؤں اور ضرورت عملہ کا بوجھ اس حادثہ کی طرح ہے جس سے کسی کو زخم آجائے تو اس نفعیہ کالم و عنصر کا وجود تپ دق کے جراثیم کے مثل ہے، اول الذکر کچھ عرصہ کی تکلیف اور علاج کے بعد مندرج ہو سکتا ہے لیکن اگر اس آخر الذکر کی مدافعت کا سامان فوری طور پر نہ کیا گیا تو اس سے جانبر ہونا ناممکن ہو جائے گا۔

پہلا ایک بہت بڑی غلطی یہ تھی کہ عملہ، مسلمان، ریکارڈ، سب کچھ دہلی رہا اور اراکین حکومت اور حکام بالا، سب کراچی پہنچ گئے۔ نتیجہ یہ کہ جب وہاں فسادات کی وجہ سے انتشار پیدا ہوا ہے تو وہاں کی ہر شے کس مہری اور لاوارثی کی حالت میں رہ گئی۔ اگر ہماری حکومت کے اراکین صل و عقد وہاں موجود ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ حکومت ہند ہمارے عملہ اور متعلقات سے اس قسم کا کس میرسانہ سلوک کرتی۔ اگر یہ پہلے کراچی آجی گئے تھے تو وہاں کی خلفشار کی اطلاع پاتے ہی انھیں فوراً موقع پہنچ جانا چاہئے تھا۔ اس طرح فیض نفوس و اموال میں اس قدر شدت نہ ہوتی۔ اس باب میں صرف دہلی اور کراچی کا ذکر کیا، مشرقی پنجاب میں بھی جب فسادات شروع ہوئے ہیں تو مسلمانوں کے بڑے بڑے اکابر (الاشارائے) سب وہاں سے پہلے ہی فرار ہو چکے تھے اور عوام بچارے بیکد کس مہری اور مظلومیت کی حالت میں رہ گئے تھے۔ عوام نے جو صلے نہیں ہارے لیکن انھیں کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ وہ کیا کریں اور کہاں جائیں۔ ہمارے نقصان (اور ایریا نقصان) کہ جس کی تلافی صدیوں تک نہیں ہو سکتی) کا بیشتر حصہ محض اس وجہ سے وقوع پذیر ہوا کہ عوام بے چارے بھڑیوں کے پنجے میں لاوارث چھوڑ دیئے گئے تھے اور اس سرانگی اور جو اس باخگی کے عالم میں انھیں کچھ سوچنا نہیں تھا کہ کیا کریں اور کسے پکاریں

ان کی بکس بنگاہیں بار بار اپنے اکابرین و قائدین کو تلاش کرتی تھیں اور خاسرونا کام گوشہ چشم میں واپس جاتی تھیں اگر اکابرین اس آزمائش میں فراہمت سے کام لیتے اور وہیں ڈٹے رہتے تو عوام کے حوصلے بندھے رہتے، ان کی تنظیم قائم رہتی اور اس طرح بھاگڑ میں بن آئی موت نہ مرنے۔ عوام کی نفسیاتی کیفیت عجیب ہوتی ہے۔ بھرے میلے میں کہیں ایک طرف سے آگے آگے "بھاگڑیجئے بھردیکھئے کس طرح بھاگڑیجتی ہے۔ کسی پر سکون جمع میں ایک چویا چھوڑ دیجئے۔ دیکھئے کس قدر خلفشار و انتشار واقع ہو جاتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی مرکزی شخصیت انھیں باواز بند پکارے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب اطمینان سے بیٹھے رہو۔ سکون قائم ہو جائیگا۔ ان علاقوں کے مسلمان، دشمنوں کے ساز و سامان سے کہیں زیادہ اس خلفشار و انتشار کی وجہ سے ہلاک ہوئے ہیں۔ اگر مختلف مقامات پر انھیں پکارنے والے موجود ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ یہ بیچارے اس طرح تباہ ہو جاتے۔ قوم پر یہ قیامت گذر رہی تھی اور راہنایان قوم اور اکابرین ملت اپنی اپنی عافیت گاہوں میں محفوظ و مصون اطمینان سے بیٹھے تھے کہ ہم تونج گئے۔ اگر ان میں کہیں حرکت و اضطراب کے آثار نمودار ہوتے تھے تو محض اپنے خویش و اقارب کو بچانے کی خاطر کسی نے بڑا نیر مارا تو میان شائع کر دیا۔ اس سے آگے بڑھے تو پناہ گزینوں کے کیمپ کا رسمی معائنہ کرائے۔ ذرا اس قیامت صغریٰ کے نتائج و عواقب کا جائزہ (Census) لے کر دیکھئے کہ عوام کس قدر رارے گئے۔ ان کے خاندان کس قدر تباہ و برباد ہوئے۔ ان کی عزت و ناموس کس درجہ برباد ہوئی۔ اور پھر یہ دیکھئے کہ راہنایان قوم میں سے کتنوں کے کوئی خراش بھی آئی! کتنوں کے خاندانوں کو ایک وقت کا فاقہ بھی کاٹنا پڑا۔ کتنوں کی آبرو پر ایک حرف بھی آیا! سوچئے کہ یہ سوچنے کی باتیں ہیں۔ اگر ان کے دل میں ذرا بھی قوم کا درد ہوتا تو ان خطرات کی آگ میں خود جل کر راکھ ہو جاتے لیکن عوام پر آج نہ آنے دیتے۔ یہ سب کو محفوظ نکال کر پھر آخیں خود باہر نکلتے۔ یہ پہلے دوسروں کی جان و آبرو کی سلامتی کی فکر کرتے اور پھر اپنوں کی طرف دیکھتے۔ ہاں! یہ ان مرنے والوں کے عین بیچ میں کھڑے ہوتے اور اگر مزاج بھی ٹہرتا تو ان سب کے ساتھ مرنے پھر دیکھتے کہ اول تو کوئی ان کی قوم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکتا۔ اور اگر ایسا ہی وقت آ جاتا تو وہ موت سب کے لئے کس قدر سکون اور اطمینان کی موت ہوتی اور ان کی قوم کا فکار کس قدر بلند ہو جاتا۔

ہے وہ چند موٹی موٹی غلطیاں جو ہماری دانست میں ہم سے تقسیم ہند کے وقت سرزد ہوئیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، بہ احتساب و تنقید، بطور شامت ہماری نہیں بلکہ بغرض اصلاح و بہبود ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ سب کچھ دانستہ کیا گیا ہے تاکہ پاکستان کو نقصان پہنچے۔ یہ فیصلوں کی اجتہادی غلطیاں ہو سکتی ہیں، پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی ایسی مصلحتیں پس پردہ ہوں جن کے پیش نظر اس قسم کے فیصلے ناگزیر ہو گئے ہوں۔ اس صورت میں مناسب یہ تھا کہ ان واقعات کے بعد، یہ مصالح و مقاصد پس پردہ، قوم پر واضح کر دیئے جاتے تاکہ قوم کے دل سے یہ غلط نفوس مٹو جو جاتے کہ یہ سب کچھ اکابرین ملت کی ناعاقبت اندیشی اور سوتدبیری سے ہوا ہے۔ نفسیاتی طور پر قوم کا اطمینان، استحکام حکومت کے لئے بڑی ضروری چیز ہے، یہ ٹھیک ہے کہ بعض راز ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں عوام پر افشا نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس قسم کی پردہ داری حالت جنگ تک محدود ہوتی ہے۔ جنگ (یا اس قسم کے واقعات کے بعد) یہ راز، راز نہیں رہتے اس وقت ان مصالح کا احقاقوم کے تحت الشعور میں عدم اعتماد کی ایک پھانس بن کر ٹھکنارہتا ہے اور علم غیبات کے ماہرین جانتے ہیں کہ یہی پھانس بڑے بڑے اہم انقلابات کا موجب بن جاتی ہے۔ غیروں کی حکومت ملکوں کو اپنے مصالح و مقاصد کا راز دار نہیں بناتی۔ اس عدم اعتماد کی پھانس کو اپنے استبدادی حیلوں سے دباتی رہتی ہے۔ یہی دبائے ہوئے جذبات ایک دن اس حکومت کے خلاف ابھرتے ہیں۔ اسی کا نام انقلابی رعب ہوتا ہے۔ اپنی حکومت ہمیشہ اپنی قوم کا اعتماد حاصل کرتی ہے۔ اور یہی اعتماد قوم اس کی بیش بہا شائع ہوتا ہے۔ جن حضرات کی انگلیاں بعض ملت پر ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت ہماری حکومت کو چاہئے کہ وہ قوم کو اپنا راز دار بنائے اور اس طرح ان کا اعتماد حاصل کرے اس خلیج کو جلد از جلد رُک کرے جو ان کے اور قوم کے درمیان حائل ہو رہی ہے۔ اس کا بہترین ذریعہ، قومی پارلیمان میں حزب مخالف کا وجود ہوتا ہے جو قوم کے جذبات کی ترجمانی کر کے، قوم کے تحت الشعور میں پھانس پیدا نہیں ہونے دیتا۔ ہمارے ہاں ابھی تک حزب مخالف وجود میں نہیں آیا۔ جب تک ایسا نہ ہو اور اب حکومت کے لئے ضروری ہے کہ دوسرے ذرائع سے قوم کو اپنے مصالح میں شریک راز کرے اور اس طرح اس کے بعد مخالفت کو دور کر دے جو عدم اعتماد کا فطری نتیجہ ہے۔ یہاں تک ان غلطیوں کے متعلق حکومت کی

طرف سے صفائی پیش کرنے کے مطالبہ کا تعلق ہے۔ باقی رہے اُن کے نتائج و عواقب، سوچو باتیں ابھی اس قابل ہیں کہ اُن کی اصلاح ہو سکے ان کی اصلاح کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہیں، مثلاً۔

(۱) فاضلہ عملہ کے مسئلہ کا فوری حل۔

(۲) بے روزگاروں کے ذرائع معاش کے لئے ملازمت کے علاوہ دوسری راہوں کا کثارت۔

(۳) حکومت کی مشینری سے غدار منافقین (ڈیشنلسٹ مسلمانوں) کا استیصال۔

(۴) وہ لوگ جنہوں نے گذشتہ حوادث و لوازل میں اپنے مقامات اور قوم کو چھوڑ کر اپنی حفاظت کی فکر کی اور قوم کے مصائب میں ان کے ساتھ شریک نہ ہوئے، قوم کی امانتوں کو اُن سے چھین کر قوم کے مخلص بہرہوں کے سپرد کیا جائے۔

(۵) قومی پارلیمان میں حزب مخالف کی تشکیل۔ اور قوم کے اعتماد عامہ کا حصول۔

(۶) تنقید صحیحہ اور احتسابِ صالحہ کی جرأت آفرینی اور اس سے سبق آموزی۔

اگر ارباب حکومت نے ہماری ان مخلص گذارشات کو درخیز اعتبار سمجھا تو ہمیں امید ہے کہ اس سے قوم کو موسیٰ ہونے لگ جائے گا کہ اب ہم محکوم نہیں ہیں اور اس طرح پاکستان کے قصرِ مشید کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائیں گی۔ کثرتِ طیبۃ اصلہا ثابۃ و فرعمانی السماء۔

دوسری طرف ہم قوم سے بھی یہ درخواست کریں گے کہ وہ اپنی پریشانیوں میں اس حقیقت کو ایک ثانیہ کے لئے بھی نظر انداز نہ ہونے دے کہ مملکتِ پاکستان ان کی اپنی ملکیت ہے۔ ان سے کوئی ایسی فعلی سرزد نہیں ہونی چاہئے جس سے اس ملکیت کی فلاح و بقا کو کسی قسم کا نقصان پہنچے کہ یہ نقصان ان کا اپنا نقصان ہوگا۔ کسی غیر کا نقصان نہیں ہوگا۔ مقصد پیش نظر اصلاح و تعمیر ہونا چاہئے نہ کہ فساد و تخریب۔ و فیہا بصائر للناس۔

بَابُ الْاِسْلَامِ سِنْدُ

گلہ جٹائے و فانا، کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
 کسی بتکرارہ میں بیاں کروں، تو کہے صنم بھی ہری ہری
 اشاعتِ ماسبق کے لغات میں صوبائیت کی غیر اسلامی نعت کا جائزہ لیتے ہوئے ہم نے نعمنا
 سندھ کے بارے میں ذکر کیا تھا اور سندھی غیر سندھی "قضیہ نامرضیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
 قائدِ اعظم کی اس تقریر کا حوالہ دیا تھا جس میں انھوں نے "سندھی، پنجابی، پٹھان اور ہلوی کے
 تنگ دائروں کو "مسلمانوں کے لئے باعثِ لعنت" بنایا تھا، اور ہم نے یہ خواہش کی تھی کہ
 خدا کرے وہ دن آجائیں کہ ہمارے سندھی بھائی باہر سے آئیں اور سندھی مسلمانوں کو
 اپنے دل کا ٹکڑہ سمجھیں اور غیر سندھی مسلمان یہاں کے مسلمانوں کو اپنا بھائی تصور کریں
 اور ان دونوں کی موافقت و محبت سے پھر سے شرمندگانِ ساحل کے اچھل کر بیکر
 ہو جانے کا نظارہ و جبہ شادابی قلب و نگاہ ہو جائے جسے دیکھنے کے لئے ہر دیدار
 حساس مضطرب و بے تاب ہے۔

ان الفاظ کی روشنائی ہنوز خشک نہیں ہونے پائی تھی اور ہماری معصوم نمتناجیبی نسل کے
 لئے بے تاب تھی کہ سندھی مقتدر کی نشست (۱۱ فروری) میں صوبہ بھر کے جمہوری نمائندوں اور
 ان نمائندوں کی نمائندہ حکومت نے یاس و تاسف کا دوا فرمایا۔ ہم پہنچا یا۔ ایوان گئے سانسے
 سرورِ عظیم کی یہ تجویز تھی کہ کراچی کو سندھ سے علیحدہ کر کے مرکز کی تحویل میں دیدیا جائے۔ کراچی قبل ازیں ایک
 موبائی شہر تھا لیکن بین الاقوامی رسل و رسائل کے بھری اور ہوائی مستقر ہونے کی وجہ سے

اس کی حیثیت تبدیل کرنا بین الاقوامی بنی گئی۔ اب پاکستان کے دار الحکومت بن جانے سے اس کی صوبائی حیثیت اور کم ہو گئی ہے۔ بہر کیف سوال یہ تھا کہ یہ شہر انتظامی طور پر مرکز کے سپرد ہو یا بدستور صوبہ کے تحت رہے۔ ہر مسئلہ کے موافق و مخالف پہلو ہوتے ہیں۔ کراچی کی علیحدگی کے حق میں اور اس کے خلاف متعدد دلائل دئے جاسکتے ہیں۔ لیکن سوچنے کی پہلی چیز یہ ہے کہ یہ سوال پیدا کیوں ہوا؟ کیا پاکستان حکومت نے اپنا مرکز اس لئے یہاں قائم کیا تھا کہ اس کی لپچائی ہوئی نظریں کراچی پر تھیں اور وہ اس بہانہ سے سندھ کو اس شہر سے محروم کر دینا چاہتی تھی؟ یا یہ سوال ہر اس شہر کی بابت پیدا ہوتا جہاں حکومت پاکستان اپنا مرکز قائم کرتی؟ پہلا جز بدامتنا خارج از بحث ہے، اگر مسئلہ کی نوعیت محض جزو ثانی ہے تو صحافت اور سیدھا ہے، مرکز کو اپنی ضروریات کے مطابق ایک شہر کو اپنی تحویل میں لینا ہے مرکز کی ضروریات بہر نوع صوبائی ضروریات پر مقدم ہیں۔ اگر پاکستان نہ ہوتا تو صوبہ سندھ کی نام نہاد خود مختاری کا عدم ہوتی اور ایک شہر کیا سارے کا سارا صوبہ ہندوستان کا ایک بے حقیقت حصہ ہوتا۔ لیکن سندھی نمائندے اظہار تشکر و امتنان کی بجائے اظہار احسان کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان نے سندھ کو محفوظ نہیں کیا بلکہ سندھ نے پاکستان کو بچا دیا ہے

زگل فروش سنالم کو اہل بازار است تپاک گرئی رفت را باغبانم سوخت

ہم اس وقت کراچی کی حیثیت کو زیر بحث نہیں لانا چاہتے کہ وہ ایک مستقل اور علیحدہ بحث ہے۔ اس وقت ہم اس افسوسناک صوبائیت کا ماتم کر رہے ہیں جس کا عریاں مظاہرہ سندھ مقننہ میں ہوا۔ کراچی سندھ کا اہم ترین شہر ہے اور صوبہ کو حق حاصل ہے کہ وہ آئینی طور پر اسے استحقاق مرکزی حکومت پر واضح کرے۔ بدلے ہوئے حالات میں کراچی کا نظم و نسق کوئی ایسی مشکل نہیں کہ باہمی گفت و شنید اور افہام و تفہیم سے حل نہ ہو سکے۔ یہ مسئلہ اسی طرح حل کرنے کا ہے۔ اس کے لئے کسی دعوامی، تحریک کی ضرورت ہے جو فضا کو خواہ مخواہ مکدر کرے اور نہ غیر معمولی شور و عمل کی کہ جس سے تینوں پر بھی خیر ہونے لگے۔

اب اجابات میں اعلان ہوا ہے کہ مرکز نے اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ جب سنہ ۱۹۴۷ء کا اجلاس ہو رہا تھا اس وقت اس قسم کا اعلان پیش نظر نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صوبائی حکومت کو غالباً سرکاری طور پر اس کا علم تھا کہ مرکز ایسی تجویز پر غور کر رہا ہے بنا بریں یہ تمام شوروشین اس لئے کیا گیا کہ مرکز مرعوب ہو کر کراچی کو عطا حالہ رہتے دے۔ جمہوریت کی اس سے بڑھ کر توہین کیا ہو سکتی ہے کہ اس ہٹ بولنگ کا اکھاڑہ مقننہ کو بنایا گیا۔

ہم نے سابقہ اشاعت میں لکھا تھا کہ صوبے انتظامی ضروریات کے تحت معرض وجود میں آئے اور وہ ضروریات کیلئے انگریزی مخصوص ضروریات تھیں۔ پاکستان کی ضروریات کا حالہ ان سے مختلف ہو گئی۔ یوں بھی حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ ایسی ضرورتیں بدلتی جاتی ہیں۔ بہرہیث صوبائی عد بندی ایک انتظامی ضرورت ہے اس سے ایک مخصوص علاقہ کا نظم و نسق اس حصہ ملک کے سپرد کر دیا جاتا ہے لیکن اس سے اس حصہ ملک کو یہ اختیار حاصل نہیں ہو جاتا کہ وہ عام ملکی ضروریات کو جن کا نائنڈہ مرکز ہوتا ہے نظر انداز کر دے۔ اس کا علاقائی نظم و نسق محدود ہوتا ہے۔ منظم اور مرکزی حکومت کی یہ محذوف شرط ہے جسے حکومت نے اذرو خود غرضی فراموش کر رہی ہے۔

مقننہ میں تجویز پیش کرتے ہوئے اعظم صاحب نے کراچی کی موہوم پلمبگی کو قرارداد لاہور (سنہ ۱۹۴۷ء) کے منافی قرار دیا کہ اس سے حکومت کی ترکیبی اجزائی خود مختاری پر زور پڑتی ہے۔ اس قسم کی وکیلاد موٹنگائیوں میں عموماً ایک سے زیادہ رائیں ہوتی ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ اگر اعظم صاحب کے نزدیک یہ دلیل ایسی ہی محکم تھی تو انہوں نے لگے ہاتھوں وہ لفظ کیوں نہ بیان کیا جس پر سب متفق ہوں۔ یعنی یہ کہ قرارداد سنہ ۱۹۴۷ء میں کہیں ذکر نہیں کیا گیا کہ مرکز کراچی ہوگا۔ اگر بغرض استدلال تسلیم کر لیا جائے کہ یہ مجوزہ اقدام قرارداد لاہور کے خلاف ہے تو کیا ایک صحیح قدم محض اس لئے نہیں اٹھایا جائے گا کہ کئی سال پیشتر ہم نے اس وقت کے تقاضوں کے مطابق جو ایک نظر یہ قائم کیا تھا اس پر اس سے زبرد پڑتی ہے؟ سنہ ۱۹۴۷ء کی قرارداد صحیفہ آسمانی نہیں کہ

آج ہم اس کو ضرورت پڑنے پر بدل نہ سکیں۔ یہ وہی ظالمانہ ذہنیت ہے جو جاہد تقلید کی پیدائش کی ہوئی ہے اور جو انسان کو زندہ اور فعال کارکن کے مقام بلند سے گر کر زندگی کے اس درک اسفل تک لے جاتی ہے۔ چہاں قرآن کے الفاظ میں "الناس واللحارہ" انسان اور پتھروں میں اکوئی امتیاز باقی نہیں رہتا اور دونوں نارہیم جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اسلام انسان کو اسی عظمت سے نکلنے کا داعی ہے۔ وہ انسان کو ان گرا بنا راطلاق و سلاسل سے نجات دینا چاہتا ہے جو اس کے ذہن نارسا اور وابستہ ہو گیا ہے۔ اپنے لئے وجہ مصیبت بنائے ہیں۔ چودہ صدیاں تک قرآنی کی بالین رحمت سے میل رہنے کے باوجود آج ہمارا ذہن اسی بوجھ سے دبا ہوا ہے جسے قرآن نے ایک ہی جھٹکے میں زمین پر سے مارتھا۔ ہم آج بھی اسی وادی جہل و عظمت میں سرگرداں ہیں جس کے ایک ایک گوشہ پر آفتاب اسلام چمک رہا ہے۔ گروائے ابا کہ ہم اسی بوجھ کے پیچھے دب جانا چاہتے ہیں جس نے کمزوری توڑ کر رکھ دی۔ ہم اسی عظمت و جہالت کی وادی میں ٹانگ لٹوئے مارتے رہنا چاہتے ہیں جو کاپل اندھوں اور خاصوین انبی کی وادی ہے اور اس نور سے بھاگتے ہیں جو زندگی کی راہیں روشن کرتا ہے۔ کراچی کا شہر ایک طرف، اگر کئی دئی غارتناشی ہو تو ہمارے صوبہ کا نظام معطل کیا جاسکتا ہے اگر ایسی نوبت آجائے تو ایک سندھ کی ہزار سندھ کو خیر ملت کے سامنے تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ ملت کا مفاد ہر علاقہ ذات مقامی ہو یا جغرافیائی، پر مقدم ہے۔ مؤخر الذکر ملت کے تابع ہیں۔ واضح رہے کہ ہم اس دلیل کو پیش کر کے ہرگز یہ ثابت نہیں کر رہے کہ کراچی کو سندھ سے جدا کر لیا جائے، ہم محض یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ذمہ دار حضرات کو اپنا نقطہ نگاہ معطل ماننا سے پیش کرنا چاہئے اور انہما پر بیان میں معقولیت کی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔ یہ روش اکی دلیل کو محکم نہیں بنائے گی اور عمومی فضا کو ناحق کتہہ بنا دے گی۔

اعظم صاحب کے بعد الحاج محمد ہاشم گذر صاحب کی باری آتی ہے۔ آپ کے خیال میں حکومت پاکستان اس قسم کا ارادہ نہیں رکھتی بلکہ چند افراد ایسا چاہتے ہیں اگر یہ درست ہے کہ بعض چند افراد ایسا چاہتے ہیں اور حکومت اس قسم کا ارادہ نہیں رکھتی تو ان میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ کیا یہ نفس کی سپرد ہے یا ملی.....

سازش میں شریک ہیں، شریک ہی نہیں بلکہ وہی اس کی ذمہ دار ہیں۔ اس کی علت گذر صاحب ایسے مجسمہ دانش و فراست کے نزدیک یہ ہے کہ وہ سندھی حکام کی شاہانہ قیام گاہوں کو حسد کی نگاہوں سے دیکھتی ہیں اور سندھیوں کو نکال کر ان کی قیام گاہوں پر قبضہ کر لیا جا رہی ہے۔ صوبہ سندھ کے ذمہ دار جمہوری نمائندہ کے یہ الفاظ جس مخلصانہ طرز استدلال کے حامل ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ہم ان سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر آپ پڑ بجا بیوں، کی طرف سے یہ الزام عائد کیا جائے کہ آپ کراچی کو ہاتھ سے اس لئے نہیں چھوڑنا چاہتے کہ آپ کی سبکدوشی و قوم کی خاطر شاہانہ قیام گاہوں سے نکلنے کی قربانی نہیں کر سکتیں تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

گذر صاحب کے بعد محترم ہارون صاحب تشریف لاتے ہیں۔ آپ اس حصہ شہر کے نمائندے ہیں جسے لیاہی کو اڑھڑکھا جاتا ہے۔ اس حصہ کی پسماندگی کو بھی آپ نے علیحدگی کراچی کے خلاف بطور دلیل استعمال کیا ہے۔ آپ کے کہنے کے مطابق حکومت سندھ نے ان سے اصلاح و ترفیع کے وعدے کر رکھے تھے (بہرچند وہ ایفا نہیں ہوئے) لیکن اگر کراچی پر بیرونی لوگوں کا قبضہ ہو گیا تو ان کی حالت اور خراب ہو جائے گی۔ لہذا وہ عزم مصمم کئے ہوئے ہیں کہ

شہر کراچی کو پاکستان کی تحویل میں نہیں جانے دیں گے۔

یہ کراچی کو پاکستان کی تحویل میں دینے کی بھی ایک ہی رہی۔ سارا صوبہ سندھ پاکستان کی تحویل میں ہے۔ مرکز کے ماتحت اس کے صوبائی اختیارات مرکز کے عطا کردہ ہیں۔ صوبہ میں کراچی شامل ہے لہذا کراچی پاکستان کی تحویل میں ہے۔ ہارون صاحب کس تبدیلی کا ذکر کر رہے ہیں؟ اگر ان کی مراد اس سے یہ ہے کہ کراچی کا انتظام براہ راست مرکز کی تحویل میں نہ ہو اور بدستور صوبہ کی تحویل میں رہے تو وہ پاکستان کا طرز ذکر کیوں کرتے ہیں؟ سادہ اور صاف الفاظ میں کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ہمیں براہ راست مرکز میں نہیں آنا چاہیے اور بس۔ پھر

آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ پاکستان کی تحویل میں چلے جانے کے بعد کراچی کے لیاری کو اسٹریٹ کی حالت بدتر ہو جائے گی؟ کیا پاکستان کا ایک صوبہ بن جانے پر سندھ کی حالت بدتر ہو گئی ہے؟ اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ سندھ حکومت جو اصلاحات نافذ نہیں کر سکی وہ مرکزی حکومت بھی نہیں کر سکے گی؟ اگر بغرض الزامی دلیل یہ کہا جائے کہ مرکز کے ماتحت ہو جانے پر لیاری کو اسٹریٹ انسانوں کی بستی نظر آنے لگے گی تو ہارون صاحب کیسے اس کی ترمیم کر سکیں گے؟

ایک ہندو نمائندہ مسٹر بھولا رام کیشو انی نے تو بات ہی ختم کر دی اور سرے سے مرکزی حکومت کا یہ حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ کراچی کو سندھ سے علیحدہ کر سکتی ہے۔ مسلمانوں کی بھری مٹھل میں ایک غیر نمائندہ کے یہ الفاظ یقیناً موجب حیرت ہونے لگے۔ اگر وہ مسلمانوں نے ایسی فضا نہ پیدا کر رکھی ہوتی جس میں ہڈ کا پاس ختم ہو جاتا ہے۔ دراصل مسٹر کیشو انی مسلمانوں کے تیغ میں ایسا نہیں کہ رہے بلکہ وہ اس قوم کے فرد ہیں جو اس سموم صوبائیت کی پروردگار ہے۔ نشاط اور عیار ہندو نے غیر سندھی کا سوال اسی لئے کھڑا کیا تھا کہ وہ بیرون سندھ کے مسلمانوں کی آمد میں اپنی اقتصادی (لہذا سیاسی) انحصار (Monopoly) اور لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ دیکھ رہا تھا، چنانچہ اس نے ایسی فضا پیدا کی جس سے غیر سندھی اور مسلمان، خصوصیت سے پنجاب سے آئے ہوئے مسلمان مراد سمجھے جائیں گے۔ کراچی (لہذا سندھ) کی تجارت بیشتر ہندوؤں کے قبضہ میں تھی۔ ان ہندوؤں میں معتد بہ غیر سندھی ہندو تھے، لیکن کیا سندھ کے مسلمان نمائندوں نے کبھی اس کے خلاف بھی احتجاج کیا؟ ایسا اگر مسلمان سندھ میں آ رہے ہیں تو اس لئے نہیں کہ سندھ جنت ارضی ہے بلکہ اس لئے کہ یہ مرکز حکومت ہے۔ مرکز حکومت ہمیشہ اسی کشش کا مالک ہوتا ہے، اور عوام و خواص لامحالہ ادھر کھینچ کر آ جاتے ہیں۔ یہی مرکز بیرون سندھ قائم ہوتا تو ان عوامل سے خود سندھی مجبور ہو جاتے کہ ادھر نقل مکانی کر لیں۔ اس کے علاوہ سندھ میں آئیوے وہ لوگ ہیں جو ہندوستان میں اپنا سب کچھ لٹا کر آئے ہیں۔ وہ یہاں آ کر سندھ سے خیرات

نہیں طلب کرتے بلکہ اپنی محنت اور عرق ریزی سے اس صوبہ کی دولت اور پیداوار میں بیش بہا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے بوائے ہوئے بیج کا پھل سندھ کو بھی ملے گا۔ انہیں پناہ دے کر سندھ ان پر احسان و کرم نہیں کر رہا، بلکہ اپنی ترقی و خوشحالی کی راہیں کھول رہا ہے۔ ذرا اعداد و شمار اٹھائے کیجئے اور دیکھئے کہ کراچی کی تعمیر و دولت میں سندھی مسلمانوں کا کتنا حصہ ہے، حکومت سندھ ان اعداد و شمار کو ہم سے بہتر جانتی ہے۔ ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ کراچی ہی نہیں بلکہ سندھ بھر میں غیر سندھی مسلمان کو جو کچھ مل رہا ہے وہ سندھی مسلمانوں کے حصہ سے چھینا نہیں جا رہا بلکہ وہ نارکین وطن ہندوؤں کا حصہ حاصل کر رہے ہیں اور وہ بھی غاصبانہ نہیں بلکہ عین حق و انصاف کے مطابق حالانکہ اگر وہ اس حصہ پر غاصبانہ قبضہ بھی کرنا چاہتے تو ہندوؤں کے طرز عمل کے مطابق یہ بھی ناروانہ تھا۔ اس لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے املاک و اموال کے مالک یہی ہندو ہندوستان پہنچ کر بننے والے ہیں۔

۲۔ حسرتیں و زبیر اعظم نے اس گفتگو کو ختم کرتے ہوئے کہا کہ مزید بحث عبث ہے۔ ہمیں خوشی کہ وزیر اعظم کو یہ احساس ہو گیا کہ بحث ضرورتاً فادیت کی حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ ہمارے اور ہر ہر خواہ ملت کے نزدیک یہ ساری بحث سرے سے عبث تھی۔ بحث کے ایام میں یا تو کراچی کی علیحدگی کا مسئلہ مرکزی حکومت کے زیر غور تھا یا نہیں تھا۔ اگر نہیں تھا تو بات ختم تھی۔ اگر تھا تو حکومت سندھ کے لئے النسب طریق کار یہ تھا کہ وہ اپنے اعتراضات باقاعدہ طور پر اور رسمی طریقہ سے مرکزی حکومت کے سامنے پیش کرتی اور اپنا نقطہ نگاہ پوری طرح واضح کرتی، ہمیں ان کے جذبات سے ہمدردی ہے۔ ہم خواہ مخواہ کراچی کو سندھ سے کاٹ دینے کے متمنی نہیں۔ البتہ اس اقدام کو جلد دیگر اقدامات کی طرح مفاد ملت کے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ملت کا مفاد اس میں ہے تو یہ اقدام فوراً ہو جانا چاہئے۔ اس میں حکومت سندھ کے لئے چمن و چراگی گنجائش نہیں۔ اور اگر یہ مفاد ملت کے لئے موزوں نہیں تو ہمیں اُمید نہیں کہ حکومت ہند خواہ مخواہ اس قسم کا اقدام کرے گی۔

ہیں افسوس ہے کہ سندھی مفنذ نے ایسی روش کا مظاہرہ کیا جس سے ہم اس تلخ نوائی پر مجبور ہو گئے وہ یقین مائیں کہ اس احتساب سے ہم مرکز پنجاب اہل پنجاب کی طرف داری نہیں کر رہے ہیں جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ پنجابی اور سندھی کی تمیز ہمارے نزدیک زمانہ قبل از اسلام کی باہلیت کی یادگار ہے اس لئے ہم اس تفریق کی تائید کیوں کرنے لگے ہیں اس احتساب سے اس غلطی کی مخالفت ہے جو شجر اسلام کی جڑوں کو کاٹ رہا ہے اور وہ اصل پھر صیٹ مردود و ملعون ہے خواہ اس کا مظاہرہ سندھی سے ہو یا پنجابی سے۔ صوبہ سے ہو یا مرکز سے۔

ہم اس احتساب کا خاتمہ اس دعا پر کرتے ہیں جس سے یہ تصور شروع کی گئی ہے اور جو اقتباس ہے سابقہ اشاعت کے صفحات کا۔

خدا کرے جلد وہ دن آجائیں کہ ہمارے سندھی بھائی باہر سے آنے والے غیر سندھی مسلمانوں کو اپنے دل کا ٹکڑہ بھین اور غیر سندھی مسلمان یہاں کے مسلمانوں کو اپنا بھائی تصور کریں اور ان دونوں کی موافق و محبت سے پھر سے ان شرمندگان حاصل کے چھل کر بیکراں ہو جائے کا نظارہ وجہ شادابی قلب و نگاہ ہو جائے جسے دیکھنے کے لئے ہر دیدہ حساس مضطرب و حساس ہے۔

یار بایں دعائے من چہ خوش است



اب آپ حکومت سندھ کی مجلس مفنذ کے ایوان سے باہر نکل کر ڈراما اس سلوک کو دیکھئے جو یہاں باہر سے آئے ہوئے مفلوک الحال مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے۔ بینغریبا لڈیا مظلوم و ستم رسیدہ، خانماں خراب، متلع بردہ، ماتم گساران ہلت جس کس سپرسی کی حالت میں یہاں پہنچے ہیں وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ پشت ہاپشت کی محنت شاقہ سے جو اتنا نہ جمع ہوا تھا وہ دنوں میں غارت ہو گیا اور ہمارے بمشکل جان و ناموس بچا کر گرتے مرتے یہاں تک پہنچے ہیں۔ یہاں انکران کے لئے مسکن نہیں، پناہ گاہ نہیں، وسیلہ معاش نہیں،

الغرض زندگی کی تمام راہیں ان پر سدود ہیں، ان کے لئے صرف ایک راستہ کھلا تھا اور وہ لگاگری تھا، لیکن ان جاکش اور غیر مسلمانوں نے اس ذلت کو گوارا نہیں کیا اور انھوں نے حلال و طیب کمائی کو ترجیح دی۔ کراچی میں دوکانوں کی تقسیم و تخصیص میں جو اندھیر لگ رہی ہوئی ہے وہ سب کو مظلوم ہے۔ ان بے چاروں کے پاس پیسے کہاں کہ رشوت دیکر دوکانیں اپنے نام مخصوص کر سکیں یا غیر معمولی قیمتیں دیکر چور باڈار سے سامان خرید کر اس سے کہیں زیادہ: اموں پر بیع سکیں چنانچہ یہ بچا بے پڑیوں اور دفالی غیر آباد گھروں پر آسمان کے نیچے بیٹھ گئے اور کسب معاش کی صورتیں پیدا کرنی شروع کیں یوں ان مانند گمان قوم سے جو بن پڑا کیا اور اپنے اور بقیہ السیف سیوی کچوں کا پیٹ پالنا شروع کیا۔ حکومت نے ان عزیز الدیادوں اور بے یاروں کو کوئی مراعات نہیں دیں، نہ انھیں دوکانوں کے لئے کوئی جگہ دی، نہ رہنے کے لئے مکان اور نہ کاروبار شروع کرنے کے لئے ضروری سرمایہ بہم پہنچایا۔ لیکن جب ان لوگوں نے شبانہ روز محنت و جانفشانی سے راہ گز پر بیٹھ بیٹھ کر کسب معاش کی خاطر سو نہیں پیدا کیں، تو حکومت کا قانون فوراً حرکت میں آیا اور ان پر یہ ذریعہ معاش بند کر دیا۔ چنانچہ ان فیصلوں کو پڑیوں پر سے اٹھا دیا گیا ہے۔ غالب کے زمانہ میں اتنا تو اطمینان تھا کہ راہ گز پر بیٹھے والوں کو کوئی نہیں اٹھا سکتا تھا لیکن بیسوس صدی میں یہ اطمینان مفقود ہے۔ اب ہماری ہمہ گیر حکومت کی دسترس سے کچھ بھی محفوظ نہیں۔ موت کے منہ سے جان جو کھوں میں ڈال کر جان بچا کر پاکستان میں پناہ ڈھونڈنے والے نیم مردہ، پاکستان میں بھی موت ہی کے منہ میں چیلے جا رہے ہیں؟ کیا اس سے یہ بہتر نہ تھا کہ وہ دشمنوں کی سفایوں کی نذر ہو جاتے؟ کم از کم وہ اس تلخی اور مایوسی کا شکار نہ ہوتے کہ جس پاکستان کے قیام کی خاطر انھوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا وہی ان کی رسوا کن موت کا باعث ہوا، وہ جسے جنت سمجھ رہے تھے وہ جہنم ثابت ہوا، وہ پھول چٹے کے لئے بڑے تو ان کی انگلیوں میں کانٹے پیوست ہوئے، وہ اپنے بنائے ہوئے پاکستان کے قلب میں اترے اور انھیں ٹھکرا دیا گیا، وہ روٹی مانگتے

نہیں تھے، انھوں نے خوں پسینہ ایک کر کے روٹی کمائی اور حکومت پر بوجھ بنا گوارا نہ کیا، لیکن حکومت نے ان کی کمائی ہونی روٹی ان سے پھین لی اور انھیں اور ان کے بھوکے بیوی بچوں کو بے رحم قانون کے رحمہ کے نیچے کھل کر رکھ دیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ خوبصورت کراچی کی کشادہ سڑکوں کی دیدہ زیب پٹریوں پر یہ عرق ریز انسانی گروہ، بھدسے، بد صورت، مغلوک الحال، انسان کٹنگ کا ٹیکہ تھے، وہ امر اور وسائے شہر کے لئے ٹھوکر تھے، دختران تہذیب نو کے لئے ان کا نفاہہ بھیانگ تھا، وہ انسان نہیں تھے بے جان پتھر تھے، ہر چلنے والے کے لئے ٹھوکر۔ ان پتھروں کا راستہ سے ہمارا دینا ہی بہتر تھا۔ اب کشادہ مظاہر ہیں کشادہ روشیں پھر سے سیر و تفریح کے لئے کھلی ہیں۔ کئی شوق اور پورے ایمان سے ٹہلے اور بھول جائے اس قیامت کو کہ جس کے اثرات سے یہ پریشان روزگار ابنوہ درابنوہ مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کا کوئی پُرساں حال نہیں۔ یہ نفاست و نزاکت بجا اور درست! لیکن قسم ہے اُس خدا نے قہ و س کی جس نے رب العالمین اور خیر البرزاقین کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا ہے کہ دنیا بھر کی نزاکتیں اور لطافتیں جنم میں جموں کدینے کے قابل ہیں اگر وہ کسی ایک انسانی بچے کے منہ سے روٹی کا لچھڑھین کر دو جو دہیں لائی گئی ہوں ہماجرین کے کثیر تعداد میں آجانے سے کراچی ویسا صاف مستحرا نہیں رہا جیسا پہلے رہا کرتا تھا۔ یہ قدرتی امر تھا۔ تقاضائے شہریت یہی ہے کہ راستے اور بازار صاف ستھرے رہیں مگر عالیہ قیامت نے جو چند چند معاشرتی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کا حل شہریت کے سطحی تقاضوں اور کاغذی احوالوں میں نہیں، یہ تباہ حال جن کو آج پتھروں کی طرح راستے سے ہٹا دیا گیا ہے، علامت ہیں اس گہرے معاشرتی مرض کی جو ہمارے جملہ ملت میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس مرض کا استیصال علامت مرض کو نگاہوں سے اوجھل کر دینے سے نہیں ہوگا، یہ طوفان ہی ہوگی۔ حکومت کو معلوم نہیں کہ اس بنے پٹریوں پر بیٹھنے والوں کو اٹھو کر کتنا ظلم عظیم کیا ہے، اس ایک حکم سے ہزاروں انسان فاقے موئے ہوں گے، یہ ٹھیک ہے کہ حکومت کا

قانون جب ضرورت پڑے حرکت میں آسکتا ہے لیکن حکومت محض قانون کا نام نہیں، اس کا کام قانون پاس کر دینا یا زاج کر دینا ہی نہیں۔ اس کے فرائض بھی ہیں۔ وہ قانون کی آڑ لیکر اپنے فرائض نبھ سکتا نہیں ہو سکتی اس کا فرض تھا کہ وہ ہجیرین کے لئے کوئی بگڑے ہوئی جہاں وہ کاروبار کر سکتے، ان کے لئے مناسب رہائش گاہیں جیتا کرتی تاکہ عام ماہوں پر سونکی بجائے وہ ان مقامات پر شب باشی کر سکتے اور شہر کی صحت کے لئے خطرہ کا موجب نہ بنتے۔ حکومت نے اپنے ان فرائض سے مجرمانہ پہلو تہی کی اور جب ہجیرین از خود راہ ہائے عمل تڑپنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کے سعی عمل کو قانون کی ایک حرکت سے اکارت کر دیا۔

نظری طور پر گڈ رنگا ہوں پر کاروباری ہجوم قابل اعتراض ہے۔ مگر حقیقت ہے کہ اس طریقے سے لاکھوں آدمی جائز وسائل معاش میں ہنہک ہو کر باعزت شہری بنتے جا رہے تھے، بیکار دماغ شیطان کی کا لگہ ہوتے ہیں۔ بیکار ہجیرین اس کلیہ کی استثنا نہیں ہوں گے ان کے لئے ہی نہیں بلکہ معاشرہ کے لئے بھی ان کا کاروبار میں معروف رہنا مفید و بہتر ہے کسپ حلال کی راہیں ان کے لئے کھلی ہونگی تو وہ پوری جانفشانی سے ان سے عہدہ برآ ہوں گے لیکن ان کو ایک دفعہ ان راہوں پر چلنے سے روک دیا گیا تو وہ معاشو کے لئے مستقل خطرہ کا باعث بن جائیں گے۔ جائز وسیلوں کے جیتا نہ ہونے سے نا جائز وسیلے سامنے آجاتے ہیں۔ پیٹ کا دورخ تو بھرا ہی ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو موجودہ جائز ذرائع سے روٹی کی کمی اجازت نہیں دیک جائے گی وہ نا جائز ذرائع سے اس کمی کو پورا کر سگے۔ جن کو شہری نہیں بننے دیا جائے گا وہ اخلاقی مجرم بنیں گے۔ جس قیامت سے مسلمان پھیلے دنوں گذرا ہے۔ اس کے بعد اگر ہمارے معاشرہ کی بنیادیں تک بھی ہل جاتیں تو بھی کچھ مستبعد نہ تھا۔ ایسے زلزلہ انگیز حوادث سے معاشرہ کی جڑیں تک اٹکھڑ جایا کرتی ہیں۔ لیکن یہ تو اللہ کا احسان ہے کہ یہاں ایسا نہیں ہوا۔ اگر خدا نکر وہ ایسی صورت پیدا ہو جاتی تو یہ فتنہ ہماری تو زائیدہ حکومت کے سینھائے سنبھل سکتا۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حکومت سندانِ خوابیدہ فتنوں کو جگا کے ہی دم لے گی اور وہ اس مجلسی حلفشمار کو برپا کر کے ہی چھوڑے گی جس سے اب تک ہم ازراہ خوش قسمتی محفوظ رہے ہیں۔ اندریں حالات ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ حقائق سے پہلو تہی نہ کرے۔ بنائیں گے لئے مناسب جگہیں مخصوص کر دی جائیں جہاں یہ بے خوف و خطر اپنا کاروبار چلا سکیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ مطلوبہ دکاناٹ اور مکانات جادو کی کڑھی سے ہینا نہیں ہو جائیں گے اور ان کی فراہمی اور تعمیر پر لامحالہ کافی وقت لگے گا۔ حکومت اس ضمن میں مجبور ہے اور ہم اس کی مجبوری کا کماحقہ احساس رکھتے ہیں لیکن حکومت یقیناً مجبور نہیں ہے کہ جن ہجارجین نے کاروبار و رہائش کی جو تبادل صورتیں پیدا کر لی ہیں اور جو امن و صحت عامہ کے لئے فوری اور حقیقی خطرہ نہیں ہے ان سے ان کو محروم کر دے۔ حکومت اگر اپنے فریضہ کی ادائیگی سے قاصر رہی ہے اور جو تبادل صورتیں جہتا نہیں کر سکتی تو ہجارجین کی پیدا کردہ صورتوں کو ان سے چھین لینا اس کے لئے کسی طور مستحسن نہیں۔ یہ سبلی اور ہنجری اقدام بغیر کسی تعمیری پہلو کے نقصان رساں ہے۔

ہم اس ضمن میں لاہور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اس حکم کا بھی جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ لاہور میں ۹ فروری سے گڈگری ختم کر دیا جائے گی۔ ہر چند اس فیصلہ کی تفصیلات ہمارے پیش نظر نہیں لیکن یہ اقدام اسی قبیل سے ہے جس پر ہم تبصرہ کرتے چلے آ رہے ہیں، تقسیم ہند یونٹو شاید کوئی ایسا ہم واقعہ نہ ہوتا لیکن تقسیم جن حالات میں معرض عمل میں آئی ہے اس سے ہمارے سامنے انواع و اقسام کے مسائل آگئے ہیں جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے مشرقی پنجاب اور ریل کی قتل گاہوں سے جو مسلمان ترح کے وہ ناقابل بیان مصائب سے دوچار ہو کر پاکستان پہنچے تعجب ہے کہ ان نیم عرباں، نیم مردہ انسانوں کا سیلاب نومولود پاکستان کو بہا کر نہیں لے گیا۔ ان میں بیشتر وہ گھرانے ابڑے ہیں کہ جو مسلمانوں کی اس برصغیر آمد کے وقت سے آباد چلے آ رہے تھے اور انہیں کوئی انقلاب اکھڑ کر پھینک نہ سکا۔ وہ اس حال

میں پاکستان اُسکے ہیں کہ ان کے بدن پر کپڑے نہیں، کھانے کے لئے روٹی نہیں، سر چھپانے کو ٹھکانا نہیں، جب ان کے لئے حکومت کی طرف سے ذریعہ معاش کا کوئی مناسب انتظام نہ کیا گیا تو وہ مجبور ہیں کہ پٹرولوں پر بیٹھ کر سو دیں اور جو اتنا مقدور بھی نہ سمجھتے ہوں وہ گداگری کریں۔ وہ حق بجانب ہیں کہ بھیک مانگیں۔ پاکستان کے لئے قربان ہونی والے پاکستان میں بھی قربان ہونا ہیں۔ چند پنیہ و رگد اگروں کو چھوڑ کر انہیں اس پیشہ سے باز رکھنے کے لئے نفسیات کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہوگی باقی گداگری لعنت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ انہیں آج تبادلہ راہوں پر ڈال دیجئے وہ فوری طور پر اس ذات کی زندگی کو ترک کر دیں گے۔

ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ گداگری ایک عمدہ ذریعہ معاش ہے اسے ضرور جاری رہنے دیا جائے، ہم جو کہہ رہے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ گداگروں کو مغرب خانوں میں جمع کر دینا علامتِ مرض کو دبا دینے کے مراد ہے۔ مرض اس کے باوجود باقی رہے گا اور اس کا دفیعہ نہیں ہو جائے گا کراچی کی پٹریاں اور لاہور کے غریب خانے ایک ہی مرض کی علامات ہیں اور اس مرض کا ایک ہی علاج ہے۔ یہ گرا مجلسی اور اقتصادی مرض ہے اور اس کا علاج معاش کی دوسری راہوں کی کٹا ہے۔ یہ مسئلہ صوبائی یا مقامی نہیں بلکہ مرکزی مسئلہ ہے اور اسے کامل تدبیر سے مرکزی طور پر یکساں حکمتِ عملی سے حل کرنا چاہئے۔ پیشہ ور یا مجبور گداگروں کو غریب خانوں میں مقید کر دیا گیا یا حوائجے والوں کو پٹریوں پر سے اٹھا دیا گیا تو قوی اعتبار سے معاملہ جوں کا توں رہے گا۔ بہر حال مہاجرین دیگر خطرات مجلسی کا باعث ہونے کے علاوہ اقتصادی بوجھ بن جائیں گے اور مفلس قوم مفلس تر ہو جائے گی۔ اشد ضرورت ہے کہ وسائل معاش کی موجودہ مضر راہوں کو کھول دیا جائے تاکہ یہ لوگ اپنے میلانات و رجحانات کے مطابق راہیں منتخب کر لیں اور محنت و عمل سے پانچائی دولت و اقتصادی فائز الیالی میں پیش از پیش اضافہ کریں۔ اس امر کو بھولنا نہیں چاہئے کہ پیشہ کسی سخت گیر قانون کے نفاذ سے حل نہیں ہو جائے گی بلکہ اس سے اس مشکل میں اور اضافہ ہوگا۔ اس کا صحیح حل یہی ہے کہ یہاں وہاں پیوند گائیکلی کرشن کے بجائے مجلسی اقتصادی

مسئلہ سمجھ کر بحیثیت کل حل کیا جائے۔ مسائل مہمہ کو مکڑے مکڑے کر کے حل کرنے کے نام ہندو طریقے فرار کی راہیں ہیں۔ انسان اور اس کے مسائل ایک نکل ہیں وہ اجزا میں منقسم نہیں ہو سکتے۔ بحیثیت کل وہ حل کے قابل ہیں اور اجزا میں بٹ کر لاپختل بناتے ہیں۔ عہد حاضر کے مصائب کا بنیادی سبب یہی ایک ہے اور یہی راہ عمل یہاں اختیار کی جا رہی ہے! اس کے متعلق اس سے زیادہ یہاں اور کیا کہا جائے کہ جہاں تباہی کے لئے جہاں تباہی کی اشد ضرورت ہے اور یہاں یہ عالم ہے کہ

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواہگی کہ خضعیں
خیر نہیں دوش بندہ پروری کیا ہے



سندھ اور پنجاب کے بعد اب بنگال کی باری آتی ہے۔ ہم نے سابقہ اشاعت میں مشرقی پاکستان کے مسلمانوں سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ صوبائی تعصب کے ٹنگنائے سے نکل کر ملت اسلامیہ کے یم پیکراں کی وسعتوں سے ہمکنار ہو جائیں۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہاں بھی اس قسم کے خیالات اٹنی اذہان سے ابھر رہے ہیں جو صوبائی حدود کو آہنی دیواریں بنانے کی تاکید کر رہے ہیں۔ پاکستان کی وحدت کے پیش نظر زبان کی وحدت کا سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس باب میں ایک بنگالی مسلمان کا خط جو بیڈہ اسٹیشن مین کی طرف زوری کی اشاعت میں شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

پاکستان کی بعض بلند پایہ ہستیاں، اردو کو سرکاری زبان قرار دینے کی فکر میں ہیں

ہم بنگالی مسلمان اس کے خلاف ہیں..... اردو و ہندوستان کی سرکاری زبان

تو ہو سکتی ہے لیکن پاکستان کی نہیں پاکستان کی سرکاری زبان بنگالی ہونی چاہئے۔

یہاں تک تو خیر ایک تجویز کی صورت ہے، آگے چل کر لکھا ہے

پاکستان کو جو دین آئے ابھی چند ماہ بھی نہیں ہوئے کہ غیر بنگالی مسلمان بنگالی

مسلمانوں پر چھائے جا رہے ہیں، اگر وہ دو سو سو ساری زبان قرار دیدیا گیا تو یہ بنگالی مسلمانوں کی ترقی کے لئے پیغام موت ہوگا۔

یہ ہیں بنگالی مسلمان اور غیر بنگالی مسلمان کی تفریق کے جراثیم جو شجر پاکستان کی جڑوں تک لے کھوکھلا کر دیں گے، انہیں کس طرح سے سمجھایا جائے کہ مسلمان فقط مسلمان ہو کر رہتا ہے، بنگالی اور غیر بنگالی نہیں ہو کرتا۔ یہ وطنی تفریق یکسر غیر اسلامی فکر کی تخلیق ہے۔ خدا کے لئے عہد جاہلیت کے ان آثار و نقوش کو دامن نگاہ سے دھو ڈالنے اور استحکام پاکستان کی خاطر جو تجویز یا تنقید آپ کو کرنی ہو اسے فالس مسلمان کے نقطہ نگاہ سے پیش کیجئے۔

اے پاکستان کے مسلمان، تیری فلاح اور بقا کا راز اس میں ہے کہ

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

نہ تو رانی رہے باقی، نہ افغانی نہ ایرانی

ہدیہ تہنیت

کاپیاں پریس میں جا چکی تھیں کہ ۲۸ فروری کی شام کو حکومت پاکستان کے وزیر مالیات، محترم غلام محمد صاحب نے اپنی بجٹ کی تقریر میں اعلان فرمایا کہ انہوں نے اقبال ایک ایڈمی کے قیام کیلئے ایک لاکھ روپے کی گرانٹ بجٹ میں شامل کی ہے۔

عزت دراز باد کہ اس ہم غنیمت است

مقام ہزار شکر گذاری ہے کہ پاکستان کے ارباب حکومت میں سے کسی کو تو خیال آیا کہ اقبال بھی اس قابل ہے کہ اس کی یاد قائم رکھی جائے۔ ہم محترم غلام محمد صاحب کی خدمت میں اس جذبہ احسان شناسی کے لئے دلی

ہدیہ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔ عیدہ ام مرتے دریں قحط الجبال

اقبال ایک ایڈمی کن خطوط پر متشکل ہونی چاہیے۔ اس کے متعلق آئندہ اشاعت میں گفتگو کی جائے گی۔ دمیدہ التوفیق

پاکستان مجلس دستور ساز کے ارکان سے

طلوع اسلام کے شمارہ گذشتہ میں ہم عنوان بالا کے تحت پاکستان کے ان ممتاز حضرات سے اجلاسِ خطاب کر چکے ہیں جنہیں اس نوزائیدہ مملکت کے دستورِ اساسی کی تشکیل کے لئے پاکستان مجلسِ دستور ساز (Constituent Asse) کا رکن منتخب کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، ان سب پر یہیتِ اہم فریضہ اور عظیم القدر ذمہ داری ہے۔ ہم نے پاکستان کی جنگ اس اصول پر لڑی کہ یہ لحاظِ مذہبِ اسلامیان ہند ایک الگ اور مستقل قوم ہیں اور ان کا قومی مزاج اس امر کا تقاضا ہے کہ ان کا الگ قومی وطن (ہوم لینڈ) ہو، جہاں وہ اپنے ملی تقاضے آزادانہ پورے کر سکیں۔ چند عوامل نے تحریکِ پاکستان کی رفتار کو تیز ضرور کر دیا لیکن اس تحریک کی بنیاد اسی اثباتی (positive) اصول پر تھی جس کا ذکر اسی ہو چکا ہے۔ الگ امتیازی قومی شخص کے احساس کے بعد یہ ناممکن تھا کہ مسلمان اپنے قومی گھر کے حصول کے لئے سرگرم عمل نہ ہوتے۔ دس سالہ جنگِ پاکستان کے دوران میں ہم نے بارہا اپنے اس عقیدہ کا اعلان کیا کہ ہم مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور ہمیں ایک ایسا قطعہ ارض چاہئے جہاں ہم قرآن کے مطابق اپنے معاشرے کو ڈھال سکیں۔ علمائے کرام اور پیرانِ عظام نے اسی عقیدہ کی بنا پر تحریکِ پاکستان کو کفر و اسلام کی جنگ کہا جس میں ایک طرف وہ طاغوتی طاقتیں صفِ آرا ہیں جو اسلام کی سر بلندی کو اپنے لئے ایک مستقل خطرہ سمجھتی ہیں اور دوسری طرف وہ عساکرِ حقِ آمادہ مبارزت ہیں جن کی زندگی کا نصب العین ہی دینِ حق کا قیام ہے۔ لیگ کے زسوار قائدین نے اسی چیز کو اپنی تقریروں اور اپنے بیانات میں دہرایا کہ لیگ اور غیر لیگ کا مسئلہ دراصل حق و باطل کا معرکہ ہے۔ قوم کے سامنے اسلام، قرآن، خدا، رسول اور قیامت کو پیش کر کے امداد و اعانت طلب کی گئی۔ قوم نے حق کی اسی دعوت پر پُر جوش لبیک کہا اور چند

سالوں میں لیگ کو ایک زندہ طاقت بنا دیا۔ لیگ کی یہ حیرت انگیز مقبولیت اور معجز اثر کامیابی لیگ کی جماعتی تنظیم کا نتیجہ یا عائدین لیگ کے ذاتی کردار کا حاصل نہ تھی بلکہ یہ اثر تھا اُس واضح اور غیر مبہم شروع (Issue) کا جو 'حق و باطل'، 'اسلام و کفر'، 'دینی ولادینی'، 'خدا و طاغوت' کی صورت میں قوم کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجالس مقلدین کے انتخابات، 'سلسلہ زبان، تعلیم، قومی ترانہ، قومی جھنڈا، دیحہ گاؤ، آئینی حقوق کی جنگ، غرض سیاسی کشمکش کے ہر مرحلے پر جب کفر و اسلام کا سوال پیدا کیا گیا تو مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ لیگ کی تحریک فی الواقعہ ایک اسلامی تحریک ہے جو پاکستان کی صورت میں ایک ایسی فضا پیدا کرنا چاہتی ہے جہاں کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ وہ ابدی قانون جاری و ساری ہو گا جس کی تشکیل انسانی ہاتھوں کی محتاج نہیں ہوئی اور انسانی دستبرد جس میں ایک غمہ برابر بھی تبدیلی نہیں کر سکی۔

پاکستان آج ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ملت پاکستان اپنی خوش بختی پر کیوں ناز نہ کرے کہ اُسے وہ عظیم المرتبت انعام، خلافتِ ارضی، عطا کیا گیا ہے جو کسی قوم پر اللہ کا سب سے بڑا احسان ہوا کرتا ہے دو سو سال کی جگر کاویاں اور سینہ سوزیاں بالآخر ختم ہوئیں اور اس قطعہ ارض کے مسلمان پھر سے اپنے گھر میں اپنی قسمت کے خود مالک بن گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان ہماری توقعات اور ہمارے اندازوں کے مقابلے میں بہت جلد حاصل ہوا ہے۔ پاکستان اگر اس برق رفتاری سے حاصل نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ سرتیو اور نرم خرام آئینی تبدیلیوں کے دوران میں اسلامی حکومت اور قرآنی قانون کے متعلق جاذب اور دلچسپ کن وعدے مسلمانوں کو بھول جاتے۔ لیکن پاکستان توقعات اور اندازوں سے اتنا پہلے مل گیا ہے کہ وہ وعدے عوامِ مسلمین کے ذہنوں میں ابھی تک تازہ ہیں اور حصولِ مقصد کے ساتھ فوراً ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ وہ بے تابی سے دریافت کرتے ہیں کہ پاکستان کے نظام کو کب قرآنی رنگ دیا جائیگا؟ اسلام کی حکومت کب قائم ہوگی؟ پاکستان کے اربابِ اقتدار اپنے اُن مراعیہ کی تکمیل کیوں نہیں کرتے جو اسلامی حکومت کے قیام کے متعلق کئے جاتے رہے ہیں؟ پاکستان کو اسلامی اسٹیٹ کہنے میں کیوں جھجک محسوس کی جا رہی ہے؟ عوام کے اضطراب اور ربابِ اختیار کے سکوت نے فضا میں اس بحث سے ارتعاش پیدا کر رکھا ہے کہ پاکستان کا طرزِ حکومت انسان ساختہ قوانین کے مطابق ہو گا یا قوانین

خداوندی کے مطابق۔

پاکستان مجلس دستور ساز کا سب سے پہلا اور اہم کام یہ تھا کہ وہ واضح الفاظ میں بتا دیتی کہ اصولاً پاکستان کا نظام حکومت کیا ہوگا۔ اگر پاکستان کو واقعی ایک اسلامی مملکت بنانا مقصود ہے تو مجلس دستور ساز کو اس کے متعلق مستند اعلان کر دینا چاہئے تھا اور اگر (خدا نکرہ) عائدین پاکستان کا خیال ہے کہ اصولوں نے اسلامی حکومت اور قرآنی نظام کے وعدے صرف اس خیال سے کئے تھے کہ ان سے بہتر عوام المسلمین کو جمع کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا اور کہ ان کا مقصود پاکستان کو (Secular) اسٹیٹ بنانا ہے تو انہیں اس امر کا بھی دستگاف اعلان کر دینا چاہئے تھا تا کہ قوم کو اس الجھن اور پرانگی سے غلصہ مل جاتی جو اس کے ذہن میں پیدا ہو چکی ہے۔ اس مسئلہ کو زیادہ عرصہ تک تذبذب کی حالت میں رکھنا مختلف خرابیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔

مجلس آئین ساز کے ارکان اپنے اس اہم فریضہ اور عظیم ذمہ داری سے عہدہ برائے نہیں ہوئے جس سے ایک گروہ اس خدشے کا اظہار کر رہا ہے کہ پاکستان میں اسلامی آئین کا نفاذ نہیں ہوگا۔ اس گروہ کے اس خدشہ اور اسلامی حکومت کے قیام کے مطالبہ کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کے ذمہ دار حضرات نے اپنی پبلک تقاریر میں پھر کہنا شروع کر دیا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی۔ چنانچہ لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان نے ۱۳ جنوری ۱۹۴۷ء کو اسلام آباد کا پٹیوٹ کے طلبہ کے ایک اجتماع میں کہا:

ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک قطعاً واضح حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔ (ڈان ۱۳/۱)

اگلے روز انہوں نے اہالیانِ پشاور کے سامنا مکہ کا جواب دیتے ہوئے کہا:

پاکستان صحیح معنوں میں ایک اسلامی اسٹیٹ ہوگی جس میں عدل و انصاف اور مساوات کے اسلامی اصولوں کا نفاذ ہوگا اور طبقاتی امتیاز ختم کر دیا جائے گا۔ پاکستان ہماری ایک تجربہ گاہ ہوگی اور ہم دنیا کو دکھا سکیں گے کہ تیرہ سو سال پہلے کے اصول آج بھی کارآمد ہو سکتے ہیں۔

اسی قسم کے خیالات کا اظہار وزیر اعظم پاکستان نے سرحدی قبائل کے متفرق اجتماعات اور راولپنڈی کے ایک جلسہ عام میں بھی کیا۔

۸ جنوری ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر نے چاگانگ میں ایک تقریر کے دوران میں کہا:

جو مضر ضمیمہ پاکستان کو اسلامی سٹیٹ بنانے پر اعتراض کرتے ہیں وہ جانتے ہی نہیں کہ اسلامی سٹیٹ سے مطلب کیا ہے۔ اسلامی سٹیٹ سے ایک ایسی سٹیٹ مراد ہے جہاں انسانوں میں مساوات ہو اور عوامداری اور معاشرتی انصاف پر سختی سے عمل کیا جائے۔ (ڈان ۱/۱۴)

۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی میں سندھ بار ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام جلسہ سیرت النبی میں تقریر کرتے ہوئے قائد اعظم نے ارشاد فرمایا:

میں تو یہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ لوگوں کو اس استفسار کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا یا نہیں۔ . . . اسلامی اصول تو ایسے ہیں جن کی نظیر دنیا میں کوئی بھی پیش نہیں کر سکتا۔ یہ اصول آج بھی اسی طرح کارآمد ہیں جس طرح آج سے تیرہ سو سال پیشتر تھے۔ (ڈان ۱/۲۶)

مسلمان اس وقت اس باب میں جس ذہنی پراگندگی کا شکار ہیں اس سے وہ تین گروہوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔

(۱) وہ مسلمان جو دیانتداری سے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلامی حکومت ایک ناممکن العمل چیز ہے اور کہ پاکستان کو ایک (Secular) سٹیٹ بنا نا چاہئے۔

(۲) وہ مسلمان جو کہتے ہیں کہ پاکستان میں قرآنی نظام کا نفاذ ہوگا لیکن جن کے دل اس بارے میں ان کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہے۔

(۳) وہ مسلمان جو دل سے چاہتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے لیکن ان کے سامنے اس قسم کی حکومت کا کوئی خاکہ موجود نہیں۔ وہ بتا نہیں سکتے کہ اسلامی حکومت دراصل کتنے کتنے ہیں

اول الذکر گروہ سے وہ جو "ایمان دار بے ایمانوں" پر مشتمل ہے، خطاب فضول ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نظریں جلوہ دانش فرنگ نے خیرہ کر رکھی ہیں اور جن کی نگاہوں میں کوئی ایسی چیز جہنم نہیں سکتی جس پر لندن یا ماسکو کی مہر ثبت نہ ہو۔ ان کے نزدیک کوئی ایسا نظام قابل قبول نہیں ہو سکتا جو مغربی مادہ پرستی کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔ لہذا یہ گروہ اس موضوع کے پیش نظر مرفوع العلم ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جسے ہم بے ایمان ایمان دار کہہ سکتے ہیں۔ پہلے اور دوسرے گروہ میں فرق یہ ہے کہ ایک زبان سے اسی چیز کا اظہار کرتا ہے جو اس کے دل میں ہے اور دوسرا اس بات کا اعلان کرتا ہے جو اس کے دل میں نہیں۔ بقولوں با خواہمہ مالیس فی قلوبھم۔ یہ گروہ یا تو بڑے دل ہے کہ اپنے دلی محققات کے اظہار سے ڈرتا ہے یا فریب کار کہ اپنے موجودہ دنیاوی مراتب کو برقرار رکھنے کی خاطر وہ بات کہتا ہے جس سے اُسے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہونے کی امید ہو سکتی ہے۔ اگر آج اسے یقین ہو جائے کہ اسلام کا نام لئے بغیر بھی وہ اپنی سیادت قائم رکھ سکتا ہے تو وہ اس تکلف کو فی الغور چھوڑ دے گا۔ اس گروہ کے وابستگان دامن کے گذشتہ کردار پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اُن کی کتاب زندگی کا کوئی گوشہ بھی اسلامی آئین سے تطابق رکھتا دکھائی نہیں دیتا۔ اور اس بنا پر ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج بھی اسلام و قرآن سے ان لوگوں کی فالہانہ شیفتگی ایک فریب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ انھوں نے عوام کی نازک رگ کو پہچان لیا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عوام کے ذہن اس چیز کو سننے اور برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جو اُن کے قلوب کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے۔ ان کے دعادی اسلام پرستی اس منافع با تاجر کی حرکت سے مختلف نہیں جو اپنی دکان کی سالاہ کو قائم رکھنے کے لئے گاہکوں کے سامنے جھوٹی قسمیں کھاتا ہے۔ ان لوگوں سے ہم گزارش کریں گے کہ وہ قوم سے مذاق کرنا چھوڑ دیں۔ ان کی قیادت کے ایوان ریت کے ستونوں پر استوار نہیں رہ سکتے۔ اس لئے جس قدر جلد وہ اس فریب کاری، طمع سازی اور منافقت کو ترک کر دیں، بہتر ہے۔

تیسرے گروہ کے قلب و دماغ میں تطابق ضرور ہے وہ ایمان داری سے چاہتا ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کی جائے لیکن وہ یا تو جانتا نہیں کہ اسلامی حکومت سے اس کا مفہوم کیا ہے۔

ادا کی ہے۔ اگر محض "سجدے کی اجازت" ہی "اسلام کی آزادی" ہے تو کہنا پڑے گا کہ ہم نے دس سال تحصیل حاصل میں گزار دیئے۔

آئیے ہم دیکھیں کہ اسلامی حکومت اور قرآنی نظام ہی کچھ ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یا اس سے مختلف اور بلند چیز ہے۔ آخر الذکر گروہ کی غلط اندیشی اسی بنیادی غلطی کی پیداوار ہے جس سے اسلام کو بھی انہی معنوں میں مذہب سمجھ لیا گیا ہے جن میں دوسرے مذاہب سمجھے جاتے ہیں۔ عام طور پر مذہب کو ایک نجی (پرائیویٹ) چیز سمجھا جاتا ہے جس کا تعلق صرف بندے اور خدا کے درمیان ہوتا ہے اور جس کا تعلق انسان کی "غیر مذہبی" زندگی سے نہیں ہوتا۔ یہ "مذہب" چند مظاہر و رسوم کا مجموعہ ہوتا ہے اسلام ان معنوں میں مذہب نہیں۔ یہ چند ظواہر و رسوم یا محض عبادات کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسان کی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ جز اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ لہذا جب ہم اسلام کا نام لیتے ہیں تو اس سے مراد "پورا" اسلام ہوتا ہے۔ چند جزئیات کو لے کر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ "پورا" یا صحیح اسلام ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوتا ہے کہ فَاذْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفٍّ (اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ)۔ اگر ہمارے پیش نظر مکمل اسلام نہ ہو تو وہ اسلام نہیں بلکہ کچھ اور ہی شے ہے۔ اسلام کا ایک حصہ اسلام نہیں ہو سکتا۔ اسلام ایک خالص چیز ہے جس میں غیر اسلام کی ہلکی سی آمیزش بھی اسے اسلام نہیں رہنے دیتی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ دودھ سے بھرے ہوئے شے کی دہی کی چند بوندیں ڈال کر اسے دودھ نہیں کہہ سکیں گے۔ اسلام میں غیر اسلام کی ملاوٹ سے یہ اسلام نہیں رہے گا۔ اس لئے کہ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ۔ حق کے ساتھ باطل ٹھہری نہیں سکتا۔ یا وہ خالص حق ہوگا یا خالص باطل۔ یہاں پر التباس حق اور باطل یعنی اسلام اور کفر میں مفاہمت (Compromise) کا تصور ہی غلط ہے۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ دو اور دو پانچ بھی غلط ہیں اور تین بھی غلط۔ اس حق اور باطل میں مفاہمت اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہم دو اور دو ساڑھے چار یا ساڑھے تین تسلیم کر لیں۔ لیکن یہ مفاہمت حق کو حق نہیں

رہنے دیگی بلکہ باطل کروے گی۔ حق اور باطل کی آمیزش سے حق، حق نہیں رہتا۔ اسی طرح اسلام یا تو سو فیصدی اسلام ہوگا یا سرے سے اسلام ہوگا ہی نہیں۔ اسی لئے قرآن کے نزدیک ان لوگوں کے اعمال قابل قبول نہیں ہو سکتے جو یَوْمِئِذٍ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَبِكَفْرٍ وَنَ بَعْضِ۔ یعنی کچھ باتوں کو تو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے۔ اس لئے کہ وَمَنْ لَّمْ يَجِدْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (جو شخص اپنے فیصلے قرآن کے مطابق نہیں کرتا وہ زمرہ کفار میں داخل ہے)۔

ان تصریحات سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اسلام کو جس رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے وہ اس کے طبعی خط و خال سے یکسر مختلف ہے۔ اور اس 'اسلام' کے اصولوں کے نفاذ کو ہم اسلامی حکومت کا نام نہیں دے سکتے۔ چند فقہی اصولوں کے اجراء کے بعد ہم یہ کہہ کر اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتے کہ ہم نے قرآن کا قانون نافذ کر دیا ہے۔ اسلامی حکومت اور قرآنی نظام سے مقصود ایسی فضا کی تخلیق ہے جس میں ہر انسان کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق مساوی مواقع مہیا کئے جائیں۔ حکومت کی طرف سے مہیا کردہ سہولتیں اور مراعات ہر شخص کے لئے مساوی ہوں۔ ترقی اور بلندیٰ مناصب کا معیار پھیلاؤ ہو بلکہ اہلیت۔ مدنی حقوق سے ہر شہری کو متمتع ہونے کا پورا موقع دیا جائے۔ قانون کی نظر میں ادنیٰ و اعلیٰ، غریب و امیر، بزدل و دولا، سب برابر ہوں۔ ہر آدمی کو اس کے طبعی رجحانات و میلانات کو بروئے کار لانے کی سہولیات مہیا کی جائیں۔ کسی شہری کو محض اس کمی کی وجہ سے ترقی کے مواقع سے محروم نہ کیا جائے کہ وہ اتفاق سے ایک ادنیٰ گھرانے میں پیدا ہوا ہے۔ حکومت مواقع کی ہم رسانی میں نجل یا امتیاز روانہ نہ کرے۔ حکومت کا کام یہ ہو کہ وہ تعلیم و تربیت اور سہولت کی راہیں کھول دے۔ بعینہ اسی طرح جیسے بجلی مہیا کرنے والا انجن اپنی قوت برابر مقدار میں سب کو مہیا کرتا ہے اگر پانچ نمبر کا برقی تمقاس قدر برقی قوت جذب نہیں کر سکتا جتنی نمبر یا ہزار نمبر کا تو اس میں اس کی اپنی صلاحیت کا قصور ہوتا ہے نہ کہ سرچشمہ برقی کا۔ اگر حکومت کے منبع فیوض سے کوئی شخص پورا فائدہ نہ اٹھا سکے تو اس میں حکومت کا نہیں بلکہ اس کے اپنے فطری جوہر کا قصور ہوگا۔

فی الواقعہ اس قسم کی فضا کی تخلیق چاہتے ہیں جس کا مہل سا خاکہ سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے؟ کیا وہ اپنی دنیوی وجاہت کو ان بلند اصولوں کی خاطر قربان کر سکتے ہیں؟ اور آئندہ ان اصولوں کی برقراری کی تاب رکھتے ہیں؟ اگر وہ یہ سب کچھ کر سکیں اور کرنا چاہیں تو غیر ضروری تاخیر کے بغیر پاکستان مجلس دستور ساز کے اجلاس روال میں اس امر کا واضح اعلان کر دیں۔ اس اجلاس میں دنیا کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ پاکستان کا مستقل دستور کیا ہوگا! قوم کو زیادہ دیر تک ذہنی کشمکش میں مبتلا رکھنا کسی صورت میں بھی قرین دانشمندی نہیں۔ قوم مجلس دستور ساز کے ارکان سے ایک ایسے ذمہ دارانہ اعلان کی توقع رکھتی ہے جس میں ذرہ برابر بھی ابہام کی گنجائش نہ ہو۔ اور اگر یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا تو آپ کو اسلامی تنفیذ کے لئے تفصیلات طے کرنے کا کام فی الفور شروع کر دینا چاہئے۔ جب یہ طے ہو جائے گا کہ ہماری مملکت میں قرآنی نظام کا قیام ہوگا تو اس صورت میں ہمارا کام آئین کی تائیس نہیں رہے گا۔ اس لئے کہ ہمارے پاس ایک مکمل ضابطہ قوانین (قرآن) موجود ہے۔ ہمارا کام صرف اس ضابطہ کی تنفیذ ہوگا۔ آئین کے اصول ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان کی جزئیات ہم طے کر سکتے ہیں۔ قرآن کے بنیادی اصولوں میں ہم تغیر و تبدل کا حق نہیں رکھتے، ان اصولوں کے حدود کے اندر اپنے زمانہ کے مقتضیات و داعیات کے پیش نظر تفاسیل میں رد و بدل ہر وقت کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی حکومت کا یہی فریضہ ہوتا ہے۔ لہذا اگر آپ خلوص دل سے اسلامی حکومت کا قیام چاہتے ہیں تو یہ نہ سوچئے کہ فلاں ملک کا آئین دینی ہے اور ہماری ہمارا مملکت میں بھی دینی آئین کے نفاذ کا وعدہ کیا گیا ہے۔ غیر مسلموں کا طرز عمل ہمارے کسی طرز عمل کے لئے وجہ جواز نہیں ہو سکتا۔ ان کے پاس کوئی ایسا نظام و آئین موجود ہی نہیں ہے وہ نافذ کر سکیں۔ ناچار انہیں نظام و آئین کے انہی خاکوں کی تقلید کرنی پڑتی ہے جو وقتاً فوقتاً انسانوں نے مشکل کئے اور وقت کے تقاضوں نے جن کی صورتیں بار بار مسخ کیں۔ ہمارے پاس ایک اکمل ترین دستور و آئین کا مجموعہ موجود ہے لہذا ہم ہدایت کے لئے غیروں کے محتاج نہیں ہو سکتے۔

مگر تو ہی خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقراں زیستن

اگر اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے آپ اپنے اراکین میں ایسے حضرات نہیں پاتے جن میں اس کی کما فیضی صلاحیت ہو، تو اس کے اعتراف میں کسی قسم کی جھجک نہیں ہونی چاہئے۔ اس صورت میں، مجلس دستور ساز سے باہر ایسے حضرات کو تعاون کے لئے مدعو کیا جاسکتا ہے، جن میں اس کام کی صلاحیت ہو۔ ترتیب ضابطہ نظام قرآن کا کام مشکل نہیں ہوگا۔ سوال صرف یہ ہے کہ آپ ایسا چاہتے بھی ہیں۔

اور اگر آپ (خدا نکرہ) یہ سمجھتے ہیں کہ اس آئین کی پابندیاں آپ پر گراں گزریں گی، یہ آپ کی مصلحت اندیشیوں کے منافی ہوگا۔ تو پھر زبان سے اس آئین کی ترویج کے دعاوی کو چھوڑ دیجئے۔ یہ — منکرمی بودن و ہمہ رنگ مستان زلیستن — کی روش زیادہ عرصہ تک کامیاب نہیں رہ سکے گی۔ خدا کرے ہمارے ارباب بست و کشاد کی سمجھ میں یہ بات آجائے۔

کچھ بھی نہیں!

(راشد ملتانی)

گر پاکستان میں مذہب کی توقیر نہیں تو کچھ بھی نہیں
 آزادی میں بھی ملت کی تعمیر نہیں تو کچھ بھی نہیں
 ملت میں اگر قوت ہی نہ ہو آئین کا تحفظ ناممکن
 مذہب کی حفاظت کرنے کو شمشیر نہیں تو کچھ بھی نہیں
 تقریروں میں تران کی تعریفیں کرنا اچھا لیکن
 دل کی گہرائی میں اس کی توقیر نہیں تو کچھ بھی نہیں
 کتنا ہی بلند و خوش منظر ایوان ہو جمہوریت کا
 اسلام کی بنیادوں پہ اگر تعمیر نہیں تو کچھ بھی نہیں

سرحد مجاہد تھے ہیں پیغام یہ قائد اعظم کو
 گر پاکستان کے حلقے میں کشمیر نہیں تو کچھ بھی نہیں

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جائے

قوم، انسانوں کے سجوم اور انبوه کا نام نہیں ہوتا۔ بلکہ عبارت ہوتی ہے انسانوں کے اس مجموعے جن میں ایک دلی اور نیک نگہی، ہم آہنگی اور ہم خیالی ہو۔

یک نگہی اور یک دلی اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب اس قوم کی تعلیم مشترک ہو، تاکہ ان کے قلب و دماغ کی تعمیر ایک ہی نقشہ کے مطابق ہو اور ان کی ذہنی اور فکری صلاحیتیں ایک ہی قالب میں ڈھل کر باہر نکلیں۔ لہذا تعمیر پاکستان میں سب سے مقدم سوال، تعلیم کا ہے۔ اگر ہماری تعلیم صحیح ہنج و اسلوب پر شروع ہو گئی تو سمجھ لیجئے کہ ہماری ملی عمارت کی بنیاد صحیح خطوط پر اٹھے گی اور اگر اس کی طرف سے ایسا ہی تساہل و تعافل برتا گیا جیسا کہ ہم نے اس سے پیشتر برتا ہے تو انسانوں کا یہ منتشر مجموعہ "تاقیامت، قوم نہیں بن سکے گا۔ میں نے "منتشر مجموعہ" کی متضاد ترکیب دانستہ استعمال کی ہے اس لئے کہ قرآن نے ایسے گروہ کے متعلق جو نظاہر اٹھا نظر آئے لیکن جن کے دلوں میں اشتراک نہ ہو، فرمایا ہے کہ **تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَا** (تو انہیں "مجموعہ خیال کریگا حالانکہ وہ مجسموعہ نہیں ہیں کیونکہ ان کے قلوب ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں)۔ اس کا نام "منتشر مجموعہ" ہے۔ قوموں میں وجود جامعیت قلبی اتلاف ہوتا ہے نہ کہ پیکروں کا اجتماع تعلیمی اشتراک کے بغیر قلبی اشتراک ناممکن ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ تعلیمی اشتراک کے لئے ضروری ہے کہ ہماری اساس و بنیاد ایک ہو جب ہم کہتے ہیں کہ تمام روسے زمین کے مسلمان ایک ملت واحدہ کے افراد ہیں۔ تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ ان کی تعلیم کی اساس و بنیاد ایک ہے۔ ان کا اختلاف رنگ و زبان اور طریق بود و ماند، فرعی ہے۔ اصل کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں۔

وہ آسائش و مینیاؤں جسے ہم نے تمام مسلمانانِ عالم کے لئے مشترک قرار دیا ہے اور جس پر ان کی آئی عمارت کو تا بہ ثریا اُستوار ہونا ہے، قرآن اور تاریخ ہے۔ قرآن، یعنی وہ ضابطہ قوانین جو ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں سرچشمہ ہدایت ہے۔ اور تاریخ، یعنی اس بات کا علم کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں اس سرچشمہ ہدایت پر عمل کس طور پر ہوتا رہا ہے۔

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ دنیا کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جو اس سے زیادہ پڑھی لیکن اس سے کم سمجھی جاتی ہو۔ اور مقامات کو چھوڑیے۔ ہمارے اسلامیہ اسکولوں اور کالجوں میں بھی جس انداز سے قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے اس کا نتیجہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ جن کالجوں میں مذہب کی تعلیم نہیں دی جاتی وہاں کے طالبِ علم زیادہ سے زیادہ دین سے بیگانہ رہ جاتے ہیں لیکن جہاں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے وہاں کے طالبِ علم مذہب سے متنفر ہو کر نکلتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں انھیں ایک طرف فلسفہ اور طبعیات کی تعلیم میں آسمانِ علم کی بلندیوں تک لے جایا جاتا ہے اور جب مذہبی تعلیم کا وقت آتا ہے تو انھیں قصص و روایات اور اساطیر و باطیل کی پستیوں میں ڈھکیل دیا جاتا ہے جس سے ان کا ذہن، خود دین ہی سے سیزر ہو جاتا ہے۔ جب ہمارا ایمان ہے کہ قرآن، انسان کو دنیا سے علم کے اقیح علیٰ تک لے جاتا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے تو اس کی تعلیم اس انداز سے ہونی چاہیے کہ اس ایمان کو ہم اپنے قلب کی گہرائیوں اور ذہن کی بلندیوں میں محسوس کریں۔ ہماری زندگیاں، قرآنی قالب میں اسی صورت میں ڈھل سکتی ہیں کہ ہم قرآنی تعلیم کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھیں اور اُسے علیٰ رؤس الاشہاد، دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ اسلئے ضروری ہے کہ قرآنی تعلیم کا ایسا انصاب تیار کیا جائے جو ابتر لائق جماعتوں سے لیکر انتہائی مدارج تک، طالبِ علم کی ذہنی استعداد کے ساتھ ساتھ چلے اور اس طرح درجہ بدرجہ اُسے پورے قرآن پر عبور حاصل ہو جائے۔ یہ کام انفرادی کوششوں کے سپرد نہیں کرنا چاہیے بلکہ حکومت پاکستان کو خود اپنے ذمے لینا چاہیے۔ ہمارے اکابرین حکومت اکثر و بیشتر اسکا اعلان فرماتے رہتے ہیں اور اگر وہ اسکا اعلان نہ بھی کریں تو بھی حقیقت ہے کہ پاکستان کا آئین قرآنی ہوگا۔ مرکزی حکومت پاکستان کے وزیرِ تعلیم، محترم فضل الرحمن صاحب نے

حال ہی میں، ڈھاکہ میں ایک عام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

گشاوارہ کی بہت سی صورتیں سامنے آجائیں گی اور موزوں حضرات کی بھی کمی نہیں رہے گی۔ مقصد تو ابتدا کرنے سے ہے۔

میں نے نہایت مختصر الفاظ میں اپنی تجویز کو پیش کیا ہے۔ میں حکومت پاکستان کے ارباب متعلقہ سے درخواست کروں گا کہ وہ اس باب میں تاخیر نہ فرمائیں اور اس سلسلہ کی ابتداء جلد از جلد کریں۔ جو حضرات میری اس تحریک سے متفق ہوں ان سے گزارش ہے کہ وہ اپنی تائید کو باب حکومت تک پہنچانے میں تامل نہ فرمائیں۔

ابومحیم، سراج پاکستانی

[سب سے پہلے طلوع اسلام اس مبارک تجویز کی بدل تائید کرتا ہے۔ اس پرچہ کی ایک کاپی، ایک تعارفی خط کے ساتھ، وزیر تعلیم، حکومت پاکستان، کراچی کی خدمت میں بھیجی جا رہی ہے جو حضرات اس تجویز سے متفق ہوں وہ بھی اپنی تائیدات، محترم وزیر تعلیم صاحب تک پہنچادیں۔ طلوع اسلام کے صفحات اس تجویز سے متعلق تمام تفصیلات و مباحث کے لئے نہایت خندہ پیشانی سے کھلے ہیں۔